مباحثہ
وہاب اشرفی

مباحثہ

پٹنہ

جلد ۸، اگست تا دسمبر ۲۰۰۹ء، شمارہ ۳۳

مدیر

وہاب اشرفی

معاون مدیر

ہمایوں اشرف

مجلس مشاورت : ارمان نجمی ، افروز اشرفی

قیمت فی شمارہ: ۵۰: روپے

زرتعاون سالانہ ۲۰۰ روپے

رابطہ

اشرفی ہاؤس ہارون نگر، سیکٹر ۲، پھلواری شریف پٹنہ

وہاب اشرفی 0943044948 — ہمایوں اشرف: 09771010715

''ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس'' کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ۶ سے شائع ہوا۔

غیر ممالک میں ''مباحثہ

''مباحثہ کی خریداری کی سہولت کے لئے ہم مختلف ممالک میں مباحثہ کے زرتعاون کی ذیل میں صراحت کرر ہے ہیں۔ آپ ہم سے براہ راست رابطہ قائم کر کے 'مباحثہ' حاصل کر سکتے ہیں۔

امریکہ	تیس (۳۰) امریکی ڈالر
کناڈا	پینتس (۳۵) ڈالر کناڈا
آسٹریلیا	بیس (۲۰) امریکی ڈالر
برطانیہ	بیس (۲۰) برطانوی پاؤنڈ
یواے ای	پچاس (۵۰) یواے ای درہم
عمان	چھ (۶) عمانی ریال
سعودی عرب	پچاس (۵۰) ریال
قطر	پچاس (۵۰) قطری ریال
کویت	چار (۴) کویتی دینار
پاکستان	سات سو (۷۰۰) پاکستانی روپئے
دیگر ایشیائی ممالک	پندرہ (۱۵) امریکی ڈالر
دیگر یوروپی ممالک	پندرہ (۱۵) یوروپی ڈالر

نوٹ: بیرونی ممالک کے خریدار زرسالانہ بینک ڈرافٹ یا چیک سے بھیجتے وقت بینک کمیشن کی مناسب شرح بھی زرسالانہ میں شامل کرلیں۔

ہمیں ہمیشہ آپ کی قیمتی آراء کا انتظار رہتا ہے

ترتیب

خصوصی مطالعات

ساز تخلیق

سوز دروں

نئی شاعری نئے تقاضے

میرے نقطہ نظر سے

نکتہ اور نکتہ دان

○○

اور یہ شمارہ

الحمدللہ کہ 'مباحثہ' کا تینتیسواں (۳۳) شمارہ آپ کے پیش نظر ہے۔ اس شمارے میں بھی پرانی روش برقرار رکھی گئی ہے۔ ذیلی سرخیوں کے ساتھ جو محتویات شائع ہوتے رہے ہیں ان میں صرف ایک اضافہ ہے اور وہ ہے 'خدو خال' کا۔ میں حصول مضامین اور شاعری کے ضمن میں بڑے ناموں کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شمارے میں جہاں بیحد اہم لوگ شریک اشاعت رہتے ہیں وہاں نئے لوگوں کی بھی جگہ محفوظ رہی ہے۔ پھر بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ نئے نام بھی ایسے نہیں کہ انہیں نظر انداز کر دیا جائے۔ ایسے تمام لکھنے والے شاعر ہوں یا ادیب اپنی کارکردگی سے اپنی شناخت بنا رہے ہیں۔ شمس بدایونی محقق کی حیثیت سے معروف ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ ان کی حمد میں بعض پہلو ایسے ہیں جو خاصے اہم معلوم ہوتے ہیں، جن پر آپ کی بھی نگاہ ہونی چاہئے۔ شان الرحمٰن ایک اچھے غزل گو ہیں، ان کی مناجات بھی اس لائق ہے کہ بار بار پڑھی جائے۔ محمد خالد اللہ عبیدی کبھی خالد عبادی لکھتے تھے، اس کے بعد خالد عبیدی، لیکن 'حق سے دعا کرو' میں ان کا نام تفصیلی طور پر آیا ہے۔ نام کی ایسی تبدیلی تخلیق کی مناسبت سے کی گئی ہے یا اس میں کوئی اور پہلو ہے میں نہیں جانتا۔ خالد ایک اہم شاعر ہیں۔ ہندو پاک میں مشہور ہیں۔ اپنے امتیازات سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہ صورت 'حق سے دعا کرو' میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ شکیل سہسرامی کی نعت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ ادھر موصوف مسلسل مختلف رسالوں میں اپنی تخلیقات چھپواتے رہے ہیں اور کم وقت میں اپنے شعری امتیازات کی وجہ سے معروف ہو رہے ہیں۔

'افکار' کے تحت چھ مضامین ہیں۔ مشتاق صدف نے گوپی چند نارنگ کے ایک بیحد اہم مضمون کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ دراصل ایک بیحد اہم مضمون نارنگ صاحب نے فراق گورکھپوری پر لکھا تھا۔ اس مضمون کی گونج اکثر سنائی دیتی ہے۔ تفہیم فراق میں اس کی حیثیت کلیدی سمجھی جاتی ہے۔ مشتاق صدف نے متعلقہ مضمون کے متون اور افکار میں داخل ہو کر اس کے عطر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ احمد سجاد اسلامی ادب سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنی بعض کتابوں اور مضامین کی وجہ سے معروف ہیں۔ جماعت اسلامی کے رکن خاص کی وجہ سے ان کی ذمہ داریاں متنوع رہی ہیں۔ موصوف کا مضمون ابوالمجاہد زاہد ہر چند کہ مختصر ہے لیکن اس میں ضروری نکات ابھر آئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ تحریر قابل مطالعہ ہے۔ ظہیر انور نے ظفر اوگانوی کی کہانی سے متعلق لکھنے میں خاصی محنت کی ہے۔ اس مضمون کا والہانہ انداز انفرادیت رکھتا ہے اور ظفر اوگانوی کے فن اور شخصیت کی تفہیم میں لازماً معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ دوسرے ادیبوں پر اس طرح کے مضامین کے لئے 'مباحثہ' کے صفحات محفوظ رہیں گے۔ معصوم عزیز کاظمی کے مضمون' کلام حیدری: شخصیت اور فن' کی پہلی قسط شائع ہوئی تو ادبی حلقے میں اس کی ہر طرح پذیرائی ہوئی اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اب آخری قسط شائع ہو رہی ہے تو پڑھنے والے کے ولولے میں مزید اضافہ ہوگا۔ کاظمی کی ہر تحریر پذیرائی کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔ یہ ایک نئے ادیب کے لئے نیک فال ہے۔ عبداللہ جاوید نے' آگ کا دریا' کے سلسلے میں دو مزید غلط فہمیوں کا سد باب کرنا چاہا ہے۔ یہاں لفظ' مزید' پر غور کیا جاسکتا ہے کہ' آگ کا دریا' جتنا معروف ہے اس سلسلے میں غلط فہمیاں بھی کچھ کم نہیں، اور وہ ہندوستان سے پاکستان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن غلط فہمیوں سے ناول کی عظمت مجروح نہیں ہوتی۔' راہ مضمون تازہ بند نہیں' دراصل صغیر افراہیم کا مضمون ہے جو انہوں نے مشہور شاعر مہتاب حیدر نقوی پر قلمبند کیا ہے۔ موصوف اب تک افسانے اور ناول کی تنقید کی طرف راجع رہے ہیں، انہوں نے اب دوسرے موضوعات کی طرف بھی توجہ کرنی شروع کی ہے۔ متعلقہ مضمون میں نقوی سے ان کی قربت محسوس کی جاسکتی ہے ساتھ ہی ساتھ علی گڑھ کے تہذیبی وادبی ماحول کے نشانات بھی ملتے ہیں، اور یہ بڑی اچھی بات ہے۔

' خدوخال' میں دو مضامین ہیں' ہم سے پوچھو کوئی فسانہ گل' اور' رفتہ مگر جاوداں: قمر رئیس کی یاد میں'۔ عبدالصمد ایک نامور فکشن نگار ہیں۔ انہوں نے شفیع جاوید جیسے درویش صفت اپنی تلاش کے شاید اہم ترین افسانہ نگار کے خدوخال واضح کرنے کی صورت اپنائی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے سرشار جذبے کو بے لگام بھی کیا ہے۔ شفیع جاوید جیسے اہم فنکار کے لئے یہ روش اپنانی

ہی چاہئے تھی۔ مجھے امید ہے کہ یہ خاکہ ادبی حلقے میں کافی مقبول ہوگا۔ پروین شیر کنیڈا میں رہتی ہیں۔ مصور ہیں اور شاعر بھی۔ پہلے ان کا ایک شعری مجموعہ 'کرچیاں' شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد حال ہی میں اپنی والدہ کی وفات پر انہوں نے متعدد نظمیں کہیں، جو ایک مجموعے 'نہال دل پر سحاب جیسے' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے۔ یہ کتاب بھی پہلی کتاب کی طرح مصور ہے۔ اس پر قمر رئیس کا بھی ایک مضمون ہے جو پروین شیر ہی سے متعلق ہے۔ اب انہوں نے قمر رئیس کی یاد میں ایک پر اثر مضمون رقم کیا ہے، جس میں موصوف کے سلسلے میں ان کے اپنے روابط کے احوال سامنے آتے ہیں۔ اس مضمون یا خاکے کی دل رنگی محسوس کی جاسکتی ہے۔

'زندگی' کے باب میں چار افسانے شائع کئے جارہے ہیں۔ مشہور اور معتبر افسانہ نگار اقبال مجید نے میری درخواست پر 'پیاسے رہنے والے' جیسا اہم افسانہ 'مباحثہ' کے لئے بھیجا۔ موصوف اپنے فن کے ائما میں ایک شمار کئے جاسکتے ہیں۔ ان کا انفرادی رنگ کئی جہات سے نمایاں ہے۔ فکر و فن کا ایسا امتزاج کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ پیاسے رہنے والے دراصل وہ لوگ ہیں جو اسلاف کی سطح سے الگ نہیں ہو سکتے اور جن کی Destiny ناخوشگوار عوامل سے تشکیل پائی ہے۔ اس افسانے کو پڑھئے اور اقبال مجید کو داد دیجئے۔ ریاض قاصدار کا 'کمدانی فراک' محرومیوں سے متعلق ہے اور اس لائق ہے کہ پڑھا جائے۔ رحمٰن شاہی نے 'دھوپ کا سائبان' میں فسادات سے متاثر ہونے والے افراد کی کہانی رقم کی ہے۔ لیکن جو لوگ مظلوم کی حفاظت کا سامان بنتے ہیں وہ لازماً قابل تعریف ہیں۔ اس موضوع پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن رحمٰن شاہی کی راہ قدرے الگ ہے۔ مشتاق احمد وانی کا 'باغی' ایک ٹوپیکل مسئلے پر ہے اس لئے قابل لحاظ ہے۔

خصوصی مطالعات میں دو شعرا زیر بحث آئے ہیں، ایک شمیم قاسمی اور دوسرے عطا عابدی۔ دونوں ہی معروف شاعر ہیں۔ میں نے شمیم قاسمی کی شاعری میں دیہی لفظیات اور ثقافت کی تلاش کرنی چاہی ہے۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ یہی دو باتیں ان کی شاعری کا جوہر ہیں۔ اسی طرح عطا عابدی نے جس طرح اپنی شاعری میں زندگی کی ناہمواریوں کو سمیٹنا چاہا ہے وہ بھی قابل مطالعہ ہے۔ میرے یہ دو مضامین جیسے بھی ہوں ان شاعروں کے فن اور فکر دونوں ہی سے متعلق ہیں۔ ان کی دس دس غزلیں بھی شائع کی جارہی ہیں۔

'ساز تخلیق' کے تحت ناوک حمزہ پوری، سلطان اختر، پروین شیر اور مظفر ابدالی کی تخلیقات شائع ہورہی ہیں۔ ناوک حمزہ پوری کی حیثیت استاد شاعر کی ہے۔ ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ دوسری صنفوں کے علاوہ رباعی گوئی سے ان کا خاصا

شغف رہا ہے۔ موصوف نے عنایت کی کہ 'مباحثہ' کے لئے چند رباعیاں کہیں، جنہیں شائع کرتے ہوئے مجھے مسرت محسوس ہو رہی ہے۔ سلطان اختر مختلف شعرا و ادبا پر رباعیاں قلمبند کر رہے ہیں۔ ان کا ایک خاص رنگ ہے۔ ویسے موصوف ایک معروف شاعر ہیں۔ ان پر میرا ایک تفصیلی مضمون 'شعر و حکمت' میں شائع ہو چکا ہے، جس کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

'سازِ تخلیق' کے تحت چھپنے والی یہ رباعیاں ظفر صدیقی پر ہیں، جو ایک اہم شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ قمر رئیس سے متعلق پروین شیر کا مضمون اسی شمارے میں شامل ہے۔ جہاں ان کی شاعری اور شعری مجموعوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کی دو نظمیں 'عارضی' اور 'گھٹن' بھی شائع کی جا رہی ہیں۔ پرویز مظفر ایک عرصے سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کی نظمیں تکنیک کے اعتبار سے درست ہوتی ہیں اور مضامین کے اعتبار سے بھی خاصی اہم۔ ان کی چار نظمیں شائع کرتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے۔ انہیں شاعری وراثت میں ملی ہے۔ ان کے والد مظفر حنفی ہند و پاک میں معروف ہیں اور اپنے امتیازات کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ پرویز انہیں کی ڈگر پر چل رہے ہیں اور اپنی صلاحیت اور محنت سے قابلِ لحاظ لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ یہ فی الحال برمنگھم میں مقیم ہیں۔

سید امین اشرف معروف شاعر ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انگریزی کے پروفیسر تھے۔ اب سبکدوش ہو چکے ہیں۔ شاعری میں ان کا ایک خاص رنگ ہے۔ میں 'مباحثہ' میں ان کے سلسلہ میں اپنی رائے لکھ چکا ہوں۔ میری درخواست پر انہوں نے اپنے پچاس اشعار انتخاب کر کے بھیجے ہیں جو 'غزل ہے شرط' کے عنوان سے اشاعت پزیر ہیں۔

'سوزِ دروں' کے تحت دوسرے شعرا جن کی غزلیں شائع ہو رہی ہیں وہ ہیں غلام مرتضیٰ راہی، شاہین، رونق شہری، قوس صدیقی، سیفی سرونجی، نجم عثمانی، شمیم ہاشمی، یعقوب تصور، حفیظ بیتاب اور کلیم اختر۔ غلام مرتضیٰ راہی سے ہم سب واقف ہیں۔ ان کی غزلوں کا آہنگ سبھوں کی نگاہ میں ہے۔ فن اور فکر پر ان کی جیسی دسترس ہے وہ محسوس کی جا سکتی ہے۔ شاہین کی غزل گوئی کے امتیازات اور امکانات پر میں کئی بار خامہ فرسائی کر چکا ہوں اور اپنی رائے پیش کرتا رہا ہوں۔ رونق شہری کی دو غزلیں شائع کرتے ہوئے مجھے مسرت محسوس ہو رہی ہے۔ کسی اور شمارے میں ان پر تفصیلی نوٹ شائع کیا جائے گا۔ قوس صدیقی نے لفظوں کے برتاؤ میں جو طریقہ کار اختیار کیا ہے وہ بیحد شخصی ہے۔ ان کی ترکیبیں الگ صورت کی ہوتی ہیں۔ جیسے 'صحرا آنچل'، 'پھول مسافر'، 'شورندی' وغیرہ۔ اسے لوگ کس رنگ میں دیکھ سکتے ہیں، یہ ایک سوالیہ نشان ہے، جس پر آپ کو غور کرنا ہے۔ سیفی سرونجی معروف شاعر اور ادیب ہیں۔ ان کا رسالہ 'انتساب' ہند و پاک اور مغرب میں معروف

ہے۔ان کی دو غزلیں یہاں شائع ہو رہی ہیں۔ان کے امتیازات کیا ہیں اس باب میں آپ کی رائے مطلوب ہے۔ نجم عثمانی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں جن کی غزل شائع کرتے ہوئے مجھے مسرت محسوس ہو رہی ہے۔ شمیم ہاشمی کی غزلیں بھی پسند کی جائیں گی، اس لئے بھی کہ ان کا آہنگ کچھ تیز ہے۔ یعقوب تصور ابوظہبی میں رہتے ہیں۔ان کی دو غزلیں شائع کرتے ہوئے مجھے بیحد مسرت محسوس ہو رہی ہے۔ یہ دونوں غزلیں اس لائق ہیں کہ بار بار پڑھی جائیں۔ان کی چند غزلیں میرے پاس محفوظ ہیں جو جستہ جستہ شائع کی جائیں گی۔ حفیظ بیتاب کی بھی غزلیں لازماً پسند کی جائیں گی اور کلیم اختر کی بھی۔ ویسے میری رایوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے 'مباحثہ' کے محتویات پر آپ کے خیالات کا انتظار رہے گا۔

'نئی شاعری نئے تقاضے' کے تحت مظفر ابدالی کی دس غزلیں شائع کی جا رہی ہیں۔ موصوف ایلائیڈ سروسز کے تحت پوسٹل سروس میں ڈائرکٹر ہیں اور فی الحال پٹنہ میں پوسٹنگ ہے۔ یوں تو بہت پہلے سے شاعری کر رہے ہیں اور ان کی تخلیقات مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہو رہی ہیں۔ان کی غزلوں کا ایک خاص انداز ہے۔ان میں زندگی کی نئی رمق صاف دکھائی دیتی ہے۔ روایت کا پاس رکھتے ہوئے وہ مختلف مسائل سے الجھتے رہے ہیں۔ ویسے ان کی نظمیں زیادہ واضح طور پر ایسے مسائل سے متصادم نظر آتی ہیں۔ ابدالی ایک محترم خاندان کے فرد ہیں۔ان کے والد سید شاہ طیب ابدالی میرے دوست رہے ہیں اور ہم دونوں مگدھ یونیورسیٹی میں ایک ہی شعبے میں کام کرتے رہے تھے۔ موصوف کا انتقال ایک بڑا سانحہ تھا۔ان کی خانقاہ اسلام پور میں تھی۔ ویسے ان کے مریدوں کی ایک بڑی تعداد پورے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ وراثت مظفر ابدالی کا حصہ ہے، جس کی جھلک ان کے کلام میں آنی چاہئے۔

اب کے زیادہ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں ہو رہے ہیں۔ صرف تین کتابیں زیر تبصرہ آئی ہیں۔ دو پر میں نے روشنی ڈالی ہے اور ایک پر ہمایوں اشرف نے۔

'نکتہ اور نکتہ داں' کے خطوط مختلف نوع کے ہیں، گرم اور نرم۔ آپ ان خطوط کے سلسلے میں بھی اپنی تفصیلی رائے لکھئے۔

وہاب اشرفی

حمد

شمس بدایونی

یہ دھوپ بھی، یہ کرم کا سحاب بھی تیرا
زمیں بھی تیری یہ خانہ خراب بھی تیرا
شبوں کے نور اجالوں کی تیرگی کی قسم
بلائے جان ہے یہ آفتاب بھی تیرا
ہیں تیری دین یہ تشکیک کے اندھیرے بھی
متاعِ علم و ہنر کا سحاب بھی تیرا
مرے شعور کے سرکش خیال بھی تیرے
مری نگاہ کا مبہم سا خواب بھی تیرا
میں تیرا عکس ہوں گر تو ہے کُل تو جزو ہوں میں
ہے میری ذات میں یہ التہاب بھی تیرا
یہ آگہی ترے علم و خبر کا صدقہ ہے
کہ شہرِ علم بھی اور اس کا باب بھی تیرا
تری بلا سے اگر ٹوٹ کر بکھر بھی گیا
ہوائے تیز بھی تیری حباب بھی تیرا
قدم قدم پہ عناں گیر ضابطے تیرے
نفس نفس میں مروج نصاب بھی تیرا
یہ کائنات غبارِ سفر ہے شمس مگر
بشر کے نام ہے یہ انتساب بھی تیرا

○○

مناجات

شان الرحمٰن

آدمی ہوں ذرا انسان بنا دے مجھ کو
یا خدا پیار کی پہچان بنا دے مجھ کو
میں کسی کے لئے دشوار اگر ہو جاؤں
رحم کر اس گھڑی آسان بنا دے مجھ کو
زندگی جب بھی تری راہ سے بھٹکے مولا
تو اگر چاہے تو ویران بنادے مجھ کو
وہ جو ظالم ہیں زمانے کو مٹانے والے
ان کی خاطر کوئی طوفان بنا دے مجھ کو
جب بلائیں ہوں مسلط مرے سر پہ مالک
کرم خاص سے حیران بنا دے مجھ کو
جس میں معصوم دعا مانگوں میں تیرے در پہ
پیارے بچوں کا وہ ارمان بنادے مجھ کو
میں جیوں تیرے لئے اور مروں تیری خاطر
یا خدا صاحب ایمان بنا دے مجھ کو

○○

حق سے دعا کرو

محمد خالد اللہ عبیدی

ہر وقت اشتعال میں رہنا گناہ ہے   اچھا تو یہ ہے سب سے ہماری نباہ ہے
رکھے نظر ہنر پہ وہی خوش نگاہ ہے   دل میں گلے عدو کو لگانے کی چاہ ہے

ورنہ یہ زندگی ہے مصائب کی پوٹلی
اللہ کو پسند ہے تائب کی پوٹلی

توبہ کرو کسی کو ستاؤ گے تم نہیں   اب سے کسی کا خون بہاؤ گے تم نہیں
احساں کسی پہ کر کے جتاؤ گے تم نہیں   یعنی چھری بغل میں دباؤ گے تم نہیں

حالات کا مقابلہ کرنا نہیں برا
یہ مت کہو مجادلہ کرنا نہیں برا

آپس میں اتفاق ضروری ہے مان لو   بگڑو گے بن کے تم نہ دلوں میں یہ ٹھان لو
ہاتھوں میں اپنے اپنے وفا کا نشان لو   دل دے رہا ہو اس کی خدارا نہ [illegible] لو

انصاف کا جنازہ نکلنے کی دیر ہے
نکلا تو چاروں سمت سمجھ لو اندھیر ہے

عاجز بنو ہر ایک کو جھک کر کرو سلام　　دل باغ باغ ہووے کرو اس طرح کلام
گلشن میں کنج ہو کہ ریگستاں میں ہو خیام　　تم مقتدی ہو خیر سے یا شہر کے امام

اہل وطن سے پیار کرو پیار کی طرح
تا کہ نہ دیکھیں وہ تمہیں اغیار کی طرح

ہے غلغلہ جہاں میں کہ دہشت پسند ہو　　کوئی یہ کہہ رہا ہے اذیت پسند ہو
دنیا کو یہ بتا دو حقیقت پسند ہو　　خیر الامم ہو اور محبت پسند ہو

تا کہ نہ اٹھے آنکھ تمہاری طرف کوئی
موتی سمجھ کے چن لے نہ سمجھے خذف کوئی

سینہ وہی ہے جس میں ہو ایماں کی روشنی　　دنیا کا اعتبار کیا دنیا تو ہے دنی
اشرار سے شریفوں کی عالم میں کب بنی　　مفلس بھی جانتا ہے کہ اللہ ہے غنی

سب جانتے ہوئے بھی نہیں جانتے ہیں کچھ
سب مانتے ہوئے بھی نہیں مانتے ہیں کچھ

کیا چاہتے نہیں کہ ہوں دنیا میں سر بلند　　ڈالیں فلک پہ اہل ہمم کی طرح کمند
دوڑے تو پھر رکے نہ کسی دشت میں سمند　　روٹی کو کوئی ترسے نہ پانی ہو ہم پہ بند

ہمت اگر ہو راہ نئی ابتدا کرو
آباد و شاد سب رہیں حق سے دعا کرو

○○

نعت شریف

شکیل سہسرامی

اک مدینے میں نہیں ہے صرف ڈیرا آپ ؐ کا
ہر دل مسلم میں ہے آقا بسیرا آپ ؐ کا
سینکڑوں ایسی مثالیں ہیں کتابوں میں بھری
لٹ گیا خود اپنے ہاتھوں ہی لٹیرا آپ ؐ کا
باعث برکت ہے بے شک دیکھنا ان کا جناب
جبہ وہ احرام و صافہ مو ، وغیرہ آپ ؐ کا
آپ ؐ ہی تو ہیں ہماری آنکھ کی ٹھنڈک حضور ؐ
چھوڑ کر جائیں کہاں کہیے ہریرہ ؓ آپ ؐ کا
آپ ؐ ہی تو وجہ تخلیق زمانہ ہیں حضور ؐ
آپ ؐ ہی کی شام ہے یہ ، ہے سویرا آپ ؐ کا
امتیاز خیر و شر کے موجد و بانی ہیں آپ ؐ
روشنی ہے آپ ہی کی ، ہے اندھیرا آپ ؐ کا
سروری سے ہے غلامی آپ ؐ کی بہتر شکیل
عاقبت اندیش ہے ہر طور پھیرا آپ ؐ کا

○○

گوپی چند نارنگ کا کلیدی مضمون

فراق گورکھپوری: کہاں کا درد بھرا تھا ترے فسانے میں ـــــ ایک تاثر

مشتاق صدف

پروفیسر گوپی چند نارنگ گزشتہ پچاس برسوں سے تنقیدی و تحقیقی مضامین اور کتابیں لکھتے رہے ہیں۔ یوں تو سب سے زیادہ ان کی توجہ یک موضوعی کتابوں پر رہی ہے لیکن اس دوران متعدد بیش قیمتی مضامین بھی تحریر کیے ہیں جن سے ایک پوری نسل فیضیاب ہوتی رہی ہے۔ شاعری پر پروفیسر گوپی چند نارنگ کے زیادہ تر مضامین عملی تنقید کے عمدہ نمونے ہیں جو نئی سوچ اور اقدار کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ اردو شاعری اور اردو کے اہم شعرا پر ان کی ایک سے بڑھ کر ایک تحریریں مل جاتی ہیں۔ ہندوستانی فکر و فلسفہ اور اردو غزل کا مضمون ہو یا میر و غالب، کبیر و انیس یا اقبال و فیض، نیز جمیل الدین عالی، محمد علوی، شہریار پر یا پھر آنند نرائن ملا، سردار جعفری، مجروح، کیفی اور فراق پر، انہوں نے جس پر بھی لکھا ایک نئے زاویۂ نظر سے لکھا اور ان کے ذہن و نظر کی نئی کشادگی اور تازگی سے ہمیں روشناس کرایا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان مضامین سے گوپی چند نارنگ کی محنت اور دلسوزی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ 'فراق گورکھپوری: کہاں کا درد بھرا تھا ترے فسانے میں' ان کا ایسا ہی مضمون ہے جس سے فراق کی افہام و تفہیم کے نئے در وا ہوتے ہیں۔

فراق گورکھپوری بیسویں صدی میں اردو کی عشقیہ شاعری اور ہندوستانی لب و لہجہ کے لحاظ سے ایک لی جنڈ تھے۔ انہوں نے خدائے سخن میر تقی میر کی شعری روایت کی بازیافت جس تمکنت کے ساتھ کی اور جس طرح انسانی تہذیب کی صدیوں پرانی روایت کو پروان چڑھایا،

ان کے معاصرین میں ایسا کوئی دوسرا دکھائی نہیں دیتا۔ اپنے مضمون میں ان تمام پہلوؤں پر نارنگ صاحب نے گفتگو کی ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے اس مضمون کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:۔

> ''ان (فراق) کی 'روپ' کی رباعیوں کے بارے میں اور جمالیاتی فکر کے بارے میں غزل کے حوالے سے جیسا وسیع اور ہمہ گیر اور جیسا اعلیٰ معیار کا مقالہ نارنگ صاحب نے لکھا ہے وہ حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے......آپ اس کو پڑھیں، اس سے اچھا مضمون نہیں لکھا گیا۔''

('فراق گورکھپوری: شاعر، نقاد، دانشور' گوپی چند نارنگ، ص، ۲۳، ۲۷)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا مضمون عنوان سے ہی ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ نارنگ صاحب نے فراق کی شاعری میں حیات و کائنات کے بھید بھرے سنگیت، حسن و عشق، انسانی تہذیب، انسانی تعلقات کی دھوپ چھاؤں، فطرت اور جمالیات کے ساتھ نشاط و درد کی کیفیتوں کو بڑی خوش اسلوبی سے آشکار کیا ہے۔ علاوہ ازیں فراق سے متعلق کچھ غلط فہمیوں اور اعتراضات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے شعری محاسن پر مدلل گفتگو کی ہے۔ نیاز فتح پوری، کلیم الدین احمد اور محمد حسن عسکری کی تحریروں سے فراق کا جو شعری معیار قائم ہوا اس سے آگے فراق فہمی اور ان کی قدر و قیمت کے تعین کی کوشش تو کی گئی لیکن فراق کو از سر نو دریافت کرنے کا سلسلہ ایک طرح سے بند سا ہو گیا تھا کہ سابقہ تحریروں پر ہی ہمارے ناقدین قانع رہے۔ پروفیسر نارنگ کے سر اس کا سہرا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے مذکورہ مضمون سے فراق کی از سر نو دریافت کی اور فراق فہمی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ دراصل ان کا یہ مضمون فراق تنقید میں کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔

نیاز فتح پوری نے پہلے فراق کی شاعری کا اسطور قائم کیا پھر بعد میں ان کی لسانی کمزوریوں کو اجاگر کیا۔ کلیم الدین احمد نے فراق کی تحسین شناسی کے ساتھ ساتھ کچھ اعتراضات بھی اٹھائے جبکہ محمد حسن عسکری نے فراق کے تحسین آمیز پہلوؤں کو ہی اپنی تحریر میں پیش کیا۔ علاوہ ازیں جگن ناتھ آزاد اور عابد علی عابد نے ان کی شاعرانہ لغزشوں کی نشاندہی کی اور شمس الرحمٰن فاروقی نے پہلے فراق کے یہاں لفظی توازن کا اعتراف کیا پھر بعد میں بدل گئے اور فراق کی شاعری پر مشروط تنقید لکھی۔ اسلوب احمد انصاری اور خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی فراق کی شاعری پر لکھا لیکن ان کے مضامین تاثراتی نوعیت کے کہے جا سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فراق کی

شاعری کے حوالے سے متذکرہ تنقیدی نگارشات سے جو اساسی اور بنیادی مباحث سامنے آئے ان پر کھل کر کسی نے نہیں لکھا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے غیر مشروط طور پر ان تمام اعتراضات اور بنیادی مسائل کو چھونے کی کوشش کی اور فراق کی شاعرانہ عظمت کو نمایاں کیا۔

شمس الرحمن فاروقی نے اپنے ایک پرانے بیان میں فراق کی شاعری میں لفظی توازن کی روایت کا اعتراف کیا تھا لیکن بعد میں انہوں نے فراق کے یہاں الفاظ کی عدم مناسبت اور الفاظ کے تاثر سے ناواقفیت کا رونا روتے ہوئے کہا کہ ''اردو غزل کی روایت سے فراق صاحب کی آگاہی بہت قلیل تھی۔'' فراق کی شاعری کے حوالے سے اس نوع کے بیانات کی کوئی اہمیت نہ تو پہلے تھی اور نہ آج ہے۔ پہلے کچھ اور پھر کچھ اور کہتے رہنا تنقید کا کبھی حصہ نہیں رہا۔ فاروقی صاحب نے ناصر کاظمی اور فراق جیسے معتبر شاعروں کے حوالے سے اپنے بیانات جس طرح بدلے ہیں اس سے اردو والوں کی عدم دلچسپی جگ ظاہر ہو چکی ہے۔ گوپی چند نارنگ نے مختصر ہی سہی غزل کی روایت سے فراق کی آگاہی پر اپنے خیالات کو ان لفظوں میں قلمبند کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

> ''ہندوستانی لہجہ اردو شاعری میں پہلے بھی تھا، فراق کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے خدائے سخن میر تقی میر کی شعری روایت کے حوالے سے اس کی بازیافت کی اور صدیوں کی آریائی روح سے ہم کلام ہو کر اسے تخلیقی اظہار کی نئی سطح دی اور آج کے انسان کے دل کی دھڑکنوں کو اس میں سمو دیا۔''

('فراق گورکھپوری: شاعر، نقاد، دانشور، ص ۳۸)

اس مختصر اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ فراق کی شاعری میں روایت کا عکس بھی ہے اور عصری حسیت بھی، یعنی فراق کی شاعری کو روایتی سیاق و سباق کے ساتھ عصری افکار و میلانات کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا جانا چاہئے۔ نارنگ صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون میں فراق کی رباعیوں میں ہندی کے ریتی کال اور سنسکرت کے شنگھار رس کے اثرات کو بھی نمایاں کیا ہے اور ہندوستانی جسم و جمال کی رنگینیوں کو بھی واشگاف کیا ہے اور اس کے لئے فراق کی آبدار رباعیوں سے چند مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:-

> ''غزل اور نظموں کے علاوہ فراق نے رباعیوں میں بھی امتیاز حاصل کیا۔ 'روپ' کے نام سے ان کی رباعیوں کا ایک مجموعہ الگ سے شائع ہوا تھا جو بیحد مقبول ہوا۔ ان رباعیوں میں سنسکرت کے شنگھار رس اور ہندی کے ریتی کال کی شاعری کا اثر ہے۔ گھریلو محبت کے ایسے مرقعے اس سے پہلے

اردو شاعری میں نہ تھے۔ ان میں ہندوستانی عورت جسم و جمال کی تمام رعنائیوں کے ساتھ اور گھر پریوار تمام لطافتوں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ عورت کا کنوار پن، بیاہتا بیوی کا سنگھرایا، ماں کا پیار دلار ان رباعیوں میں طرح طرح سے بیان ہوا ہے۔ ان میں ممتا کی کسک بھی ہے اور جسم و جمال کی رنگینیوں سے آباد آنند اور رس بھری کیفیتیں بھی:

دوشیزہ فضا میں لہلہایا ہوا روپ
آئینۂ صبح میں چھلکتا ہوا روپ
یہ نرم نکھار، یہ سج دھج، یہ سگندھ
رس میں کنوارے پن کے ڈوبا ہوا روپ

آنسو بھرے بھرے وہ نینا رس کے
ساجن کب اے سکھی تھے اپنے بس کے
یہ چاندنی رات یہ برہ کی پیڑا
جس طرح الٹ گئی ہو ناگن ڈس کے

موتی کی کان رس کا ساگر ہے بدن
درپن آکاس کا سراسر ہے بدن
انگڑائی میں راج ہنس تولے ہوئے پر
یا دودھ بھرا مانسرور ہے بدن

ڈھلکتا آنچل دمکتے سینے پہ الک
پلکوں کی اوٹ مسکراہٹ کی جھلک
وہ ماتھے کی کہکشاں وہ موتی بھری مانگ
وہ گود میں ننھا سا ہمکتا بالک

ہے بیاہتا پر روپ ابھی کنوارا ہے
ماں ہے پر ادا جو بھی ہے دوشیزہ ہے

وہ موڈ بھری ، مانگ بھری ، گود بھری
کنیا ہے ، سہاگن ہے ، جگت ماتا ہے

('فراق گورکھپوری، شاعر، نقاد، دانشور'، ص ۴۳، ۴۱)

اردو کے ہمارے کئی ناقدین نے فراق کی لسانی کمزوریوں اور زبان و بیان کے کھردرے پن پر سوال اٹھائے ہیں۔ ان کا جواب بھی نارنگ صاحب نے دیا ہے۔ فراق صاحب کا زبان کے بارے میں کیا نظریہ تھا اور وہ کیوں مصنوعی زبان کے مخالف تھے۔ وہ اردو اور ہندی کے باہمی رشتے کو کس طرح سے دیکھتے تھے، ان سب کا جواب نارنگ صاحب کے اس اقتباس میں ملاحظہ کیجیے:-

''زبان کے بارے میں فراق کا ایک خاص نظریہ تھا۔ ان کی شاعری نے اپنا رس جس کھڑی بولی کے واسطے سے پراکرتوں کی صدیوں پرانی روایت سے لیا تھا وہ فارسی جانتے تھے ا ان کے یہاں فارسی ترکیبوں کا خاصا استعمال ملتا ہے۔ لیکن وہ کھڑی کے ٹھیٹھ ٹھاٹ اور اردو کے اس اردو پن پر جان دیتے تھے جو صدیوں کے تہذیبی لین دین اور لسانی اور تاریخی عمل سے وجود میں آیا ہے۔ وہ مصنوعی زبان کے اس لئے خلاف تھے تا کہ ہندی والے اردو کے لسانی تمول اور جمالیاتی حسن کو پہچانیں، ایک خوبصورت ہندوستانی زبان کے طور پر اس کی قدر کریں، اور قومی زبان ہندی کی تشکیل میں اس سے مدد لیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو نے سات سو آٹھ سو برس کے سماجی، تاریخی عمل میں کھڑی کو نکھارا، بنایا اور سنوارا ہے اور اسے شائستہ و شستہ روپ دیا ہے۔ اس لئے اردو کے روز مرہ اور لسانی اصولوں کی خلاف ورزی خوش مذاقی کے خلاف ہے۔''

('فراق گورکھپوری، شاعر، نقاد، دانشور'، ص ۴۳، ۴۴)

ہمارے کچھ نقادوں نے فراق کو سیاسی شاعر قرار دیا اور سیاست سے متاثر ہو کر فراق کی کچھ غزلوں، نظموں اور رباعیوں کا حوالہ بھی پیش کیا۔ ان کی کچھ تقریروں اور تحریروں کو بنیاد بنا کر فراق کے نظریہ ادب و سیاست کو واضح کرتے ہوئے انہیں کمیونسٹ شاعروں کی صف میں شامل کیا، اور یہاں تک لکھا کہ سیاست اور اشتراکیت نے فراق کے ذہن و شعور اور وجدان کو بہت متاثر کیا جس سے اردو کی عشقیہ شاعری میں تبدیلیاں آئیں اور تصور عشق اور تصور جمال بھی متاثر ہوا۔

اس نوع کے سکہ بند اور مکتبی نقطۂ نظر رکھنے والے نقادوں نے اپنی بات کی حمایت میں فراق کے کچھ اشعار اور اقتباس پیش کر کے کمیونزم اور اشتراکیت سے ان کی وابستگی اور ان کے تصور شعر کو ظاہر کرنے کی سعی کی ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے بھی فراق سے ایک اقتباس کو Quote کیا ہے جسے آپ بھی ملاحظہ کیجئے:-

> "شاعری میں عظمت عالم گیری اور پائیداری کے لئے آفاقی وسعت ایک صفت ضرور ہے لیکن وہ سب کچھ نہیں ہے۔ کائنات ایک ٹھوس اور بھرپور حقیقت ہے (ذرا دیکھئے) جیتی جاگتی چلتی پھرتی دنیا ہے۔ اس کا جدلیاتی تنوع اس کے بحر ذخار میں موج کا موج سے ٹکرانا اور مل کر ایک لہر بن جانا اور اس طرح جوار بھاٹوں کا ایک لامتناہی سلسلہ یہ ٹھاٹھیں مارتا جیون ساگر شاعر کے نغموں میں چھلکتا اور لہراتا نظر آنا چاہئے۔"

('فراق گورکھپوری، شاعر، نقاد، دانشور'، ص ۲۸)

اب فراق کے یہ چند اشعار ملاحظہ کیجئے جن کو بہت سے لکھنے والوں نے اپنے اپنے طور پر استعمال کیا ہے:

اہل زنداں کا یہ مجمع ہے ثبوت اس کا فراقؔ
کہ بکھر کر بھی یہ شیرازہ پریشاں نہ ہوا

چھوٹی سی ایک قوم نے ہمت ہی توڑ دی
اک دست ناتواں نے کلائی مروڑ دی

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرت پرواز کی باتیں کرو

دیکھ رفتار انقلاب فراقؔ
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

جھپک رہی ہیں زمان و مکاں کی بھی آنکھیں
مگر ہے قافلہ آمادۂ سفر پھر بھی

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے کوئی ذرہ بھی محو خواب نہیں

پروفیسر گوپی چند نارنگ فراق کو سیاسی شاعر نہیں مانتے۔ انہوں نے دلائل کے ساتھ اپنے اس مضمون سے ان لوگوں کو از سر نو سوچنے پر مجبور کر دیا جو فراق کو آزاد خیال، لبرل اور انسان دوست شاعر کم اور سیاسی شاعر زیادہ تسلیم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"فراق سیاسی شاعر نہیں تھے۔ انہیں ایک ایسا آزاد خیال، لبرل شاعر کہا جا سکتا ہے جو انسان دوستی کا گہرا احساس رکھتا ہے۔ ان کا کہنا تھا 'میری کوشش رہی ہے کہ ایک بلند ترین، پاکیزہ ترین اور خیر و برکت سے معمور کائنات کی تخلیق کروں اور اپنی شاعری کے ذریعے انسانیت کو گہرا اور بلند بناؤں۔' ان کا دل ایک چوٹ کھائے ہوئے انسان کا دل تھا۔ جمالیاتی کیفیتوں کے ساتھ دکھ کی ایک دھیمی لہر ان کی پوری شاعری میں رواں دواں ہے جو آج کی زندگی کی پیچیدگی اور آج کے انسان کے درد و کرب سے ہم آہنگ ہے۔ یہ ٹیس ان کے ہاں دب دب کر ابھرتی ہے۔"

('فراق گورکھپوری، شاعر، نقاد، دانشور' ص ۴۰)

پروفیسر نارنگ نے اپنے اس بیان کے ثبوت میں فراق کے چند اشعار پیش کئے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

فراقؔ دوڑ گئی روح سی زمانے میں
کہاں کا درد بھرا تھا مرے فسانے میں

یہ زندگی کے کڑے کوس، یاد آتا ہے
تری نگاہ کرم کا گھنا گھنا سایہ

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

اے معنی کائنات مجھ میں آجا
اے راز صفات و ذات مجھ میں آجا

سوتا سنسار جھلملاتے تارے
اب بھیگ چلی ہے رات مجھ میں آجا

کسی کی بزم طرب میں حیات بٹتی تھی
امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

سوال یہ ہے کہ اگر فراق کمیونزم اور اشتراکیت کے دلدادہ تھے اور سکہ بند ترقی پسند تھے تو سردار جعفری نے 'شاہراہ' میں فراق کی ترقی پسندی کیوں لکھا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے فیض احمد فیض اور معین احسن جذبی کی ترقی پسندی کے خلاف بھی 'شاہراہ' میں ہی لکھا۔ سوال یہ بھی ہے کہ اگر فراق اشتراکی نظریے کے غیر مشروط حامی تھے تو پھر ترقی پسند تحریک کے کچھ اہم ٹھیکداروں نے ان کی رحلت کے ۲۵ برس بعد بھی ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے کی زحمت کیوں نہیں کی۔ قمر رئیس جیسے ترقی پسند نقاد نے بھی یہ اعتراف کیا کہ انہوں نے فراق کی تنقید پر مضمون لکھا لیکن ان کی شاعری کا مطالعہ کبھی بالاستعاب نہیں کیا:۔

"فراق کا میں گرویدہ تو ضرور رہا ہوں لیکن میں نے کبھی بالاستعاب ان کی شاعری کا مطالعہ نہیں کیا۔ ان کی تنقید نگاری پر دہلی یونیورسیٹی کے ایک سمینار کے لئے تیس پینتیس سال پہلے مضمون لکھا تھا۔"

('فراق گورکھپوری، شاعر، نقاد، دانشور' ص ۲۲)

سچ یہ بھی ہے کہ کچھ الہ آبادی ترقی پسندوں نے انہیں ایک خول میں ہمیشہ قید کر کے رکھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ "فراق ایک آزاد خیال اور لبرل شاعر تھے۔" اس پہلو کو ترقی پسندوں نے ہمیشہ نظر انداز کیا۔ تاسف کی بات یہ ہے کہ جنہوں نے فراق کے کلام کا بغائر مطالعہ کبھی نہیں کیا انہوں نے ہی فراق کو ایک مخصوص خانے میں رکھنے کی کوشش کی۔

ہمارے کچھ سخت گیر نقادوں نے فراق کی تنقیدی تحریروں کو بھی نشانہ بنا کر ان کا قد گھٹانے کی کوشش کی بلکہ تنقیدی نگارشات کو بنیاد بنا کر ان کی شاعری کو جانچا اور پرکھا۔ یہی نہیں بلکہ ان کی شاعری کا میر و غالب سے موازنہ اور تقابل کر کے ان کی شاعرانہ عظمت پر سوالیہ نشان بھی قائم کیا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے دلائل کے ساتھ فراق کو ایک باکمال اور صدیوں میں پیدا ہونے والا شاعر قرار دے کر ان سخت گیر نقادوں کو کڑوی کسیلی صداقتوں سے روشناس کرایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"فراق کے پایے کے شاعر کہیں صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ بیشک ایسے

منفرد اور باکمال شاعر کے اٹھ جانے سے اردو شاعری کا ایک دور ختم ہو گیا۔
فراق اب ہم میں نہیں لیکن ان کی آواز فضاؤں میں ہمیشہ گونجتی رہے گی۔"
('فراق گورکھپوری، شاعر، نقاد، دانشور، ص ۴۴)

خلاصہ مضمون یہ کہ گوپی چند نارنگ نے فراق کو ایک لبرل، آزاد خیال، انسان دوست اور اعلی پایے کا شاعر قرار دیا ہے۔ دراصل ان کا یہ مضمون فراق فہمی میں ایک سرچشمے کی حیثیت رکھتا ہے جس سے آنے والی نسلیں سیراب ہوتی رہیں گی۔

○○

رنگ ونور کا شاعر : ابوالمجاہد زاہد

احمد سجاد

اگر غور کیجئے تو یہ پوری کائنات رنگ ونور سے معمور ہی نہیں، اس کی تخلیق کا ایک شاہکار بھی ہے جہاں نور وظلمت اور حق وباطل کی باہمی کشمکش ایک ازلی وابدی حقیقت بھی ہے۔ انسانی زندگی ازل ہی سے روشنی سے کسب فیض اور تاریکی سے گریز اختیار کرتی رہی ہے۔ بہت سے فلسفیوں اور روحانیوں کا خیال ہے کہ ارض وسما کا خالق بھی ایک نور ہی ہے۔ اللہ نور السموت والارض۔ الہامی صحیفوں کی بشارت یہ ہے کہ بہشتی زندگی کی سب سے بڑی نعمت دیدار نور الٰہی ہوگی۔

خالق حقیقی نے گوناگوں تخلیقات کے تین درجے یا تین قسمیں بنائی ہیں۔ مٹی، آگ اور نور، ارضی تخلیقات مٹی سے، جن آگ سے اور فرشتے نور سے پیدا کئے گئے ہیں۔ ایران کے زرتشت نے اپنے مذہب کی بنیاد ہی انوار پرستی یا آتش پرستی پر قائم کی تھی۔ جس کی توسیع روشنی کے نمائندے اہرمزا اور تاریکی کے اہرمن کی شکل میں ہوئی۔ آریائی اساطیر میں اگنی سورج اور اندر دیوتا کی پوجا، انوار پرستی ہی کے شاخسانے کہے جاتے ہیں۔ بعض ماہرین کے خیال میں مشہور فرانسیسی فلسفی برگساں کا نظریہ تحرک، روح کائنات کو تحرک اور روشنی جیسی نسبتاً تیز مادی صورتوں میں پیش کرتا ہے۔ واضح ہو کہ آنکھیں دو ہی حقیقتوں کا ادراک کرتی ہیں، روشنی اور تاریکی۔ ان میں سے روشنی حدود اور نقوش کو نمایاں کرتی ہے اور تاریکی حدوں کو مٹاتی، نقوش کو مدھم کرتی اور زندگی کو ابدی نیند سلا دینے کی کوشش کرتی ہے اسی لئے یہ نیکی کے مقابلے میں بدی کی مظہر ہے۔ جدید نفسیات نے انسان کے اندرون میں بہت گہرائی تک جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ روشنی اور تاریکی نے اس قدیمی تصادم کو آرکی ٹائپ کا نام دیا ہے جسے شاعر بسا اوقات

اپنے اندرون میں غواصی کر کے اپنی تخلیق میں عجیب سی توانائی اور شادابی کو منعکس کرتا ہے جس کے نتیجے میں کلام کی سچائی انوکھی تازگی کے ساتھ منظر عام پر آتی ہے۔

ابوالمجاہد زاہد کے تا حال تین شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ کئی شعری و نثری مجموعے منتظر اشاعت ہیں۔ ''تگ وتاز'' (۱۹۵۷ء) ''کھلتی کلیاں'' (۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۰ء) ان کے عہد شباب کے ایسے مجموعے ہیں جن میں موضوع کی مناسبت سے رنگ ونور کے مقابلے میں حرکت وحرارت کا اثر غالب ہے۔ کئی مجموعے منتظر اشاعت ہیں مگر آخری مطبوعہ مجموعہ ''ید بیضا'' (۱۹۹۸ء) اسم بامسمّی ہے۔ شاعر نے یہ نام مجموعہ کو پر معنی بنانے کے لئے تلمیحی انداز میں اوڑھنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اس مجموعہ کا قاری سرسری طور پر بھی نظر ڈالے تو حمد، نعت، منقبت، غزل اور نظم ہر جگہ شاعر کا تابناک نوری انداز بیان بڑے موثر انداز میں چھلکا پڑتا ہے۔ مذکورہ اولین تین موضوعات (حمد، نعت، منقبت) کو شاعر نے ''حرف تابندہ'' کا عنوان دیا ہے۔ حمد ونعت کے منظوم فرق جلی کو بتانے کے بعد ''دعا'' اس حصے کی پہلی نظم ہے جس میں شاعر نے خالق کائنات سے بڑی عاجزی کے ساتھ سہل ممتنع میں جو دعا کی ہے اس کے اولین تین اشعار ملاحظہ ہوں:

مرے فکر و احساس کو جگمگا دے — ستاروں کو تابندگی دینے والے

مرے دل کو بھی نور ایماں سے بھر دے — مہہ و مہر کو روشنی دینے والے

مرا مقصد زندگی بھی حسیں ہو — گل و غنچہ کو تازگی دینے والے

دوسری ''حمد'' کے یہ اشعار بھی توجہ کش ہیں:

دھوپ بھی اور چھاؤں بھی اے آدمی! دیتا ہے کون؟
کیا کبھی سوچا کہ غم دیتا، خوشی دیتا ہے کون؟
کون حور صبح کو دیتا ہے جھومر، مہر کا
شب کو تاروں کی جھمکتی اوڑھنی دیتا ہے کون؟
جگنوؤں کو کون پہناتا ہے نورانی لباس
سات رنگوں کی 'دھنک' کو چونری دیتا ہے کون؟
یہ ستارے یہ گل و لالہ یہ چنچل تتلیاں
ان حسینوں کو ادائے دلبری دیتا ہے کون؟

دس بندوں کی ایک معنی خیز مگر حسین نظم کا عنوان ''قل ھو اللہ'' ہے، جس کا آغاز بڑے ڈرامائی انداز میں کیا ہے کہ فلک پر دمکنے والے شرارے اور پر نور پارے سو گئے ہیں اور شوخ تاروں سے لبوں کی مسکراہٹ کھو گئی ہے۔ رفتہ رفتہ رات کے قدموں کی آہٹ بھی کھو گئی ہے وغیرہ۔ اسی طرح نعتیہ نظمیں مثلاً ''رحمت اللعالمین'' اور ''پیغمبر اسلام'' وغیرہ میں جن ترکیبوں اور استعاروں میں حضورؐ کی صفات کو بیان کیا ہے ان میں سے چند ملاحظہ ہوں۔ ''اخوت کی شمعیں، ذروں کو رونق طور دینے والے۔ اندھیرے پہ بارش نور فضاؤں کو منور اور ہواؤں کو معطر کرنے والے کتاب مبین و منور، دین روشن، آئینہ حق تجلی مجلیٰ، بدر الدجیٰ، شمس الضحیٰ'' وغیرہ۔

ابوالمجاہد زاہد کی ایک شاہکار نعت کے چند اشعار کی یاد تازہ کیے بغیر ان کی پر کیف نورانی شاعری کے وفور اور ذوق وشوق سے پر لب ولہجہ کا واقعی اندازہ کرنا مشکل ہے:

جب حرا سے ہویدا ہوئی روشنی — تیرگی چیخ اٹھی روشنی روشنی

تیرا منکر کہاں؟ تیرا مومن کہاں — تیرگی تیرگی، روشنی روشنی

تیرے صدیقؓ، فاروقؓ، عثمانؓ، علیؓ — روشنی روشنی، روشنی روشنی

پیروان محمدؐ کی کیا بات ہے — زیست بھی روشنی، موت بھی روشنی

سوال یہ ہے کہ رنگ ونور سے یہ شرابور مگر پر کیف شاعری، تاریکی کی گھبراہٹ، اس پر غالب آنے کا جوش وجذبہ جسمانی اعتبار سے بظاہر اس ''مشت استخواں'' میں آیا کہاں سے۔ اس کے لئے ان کی تعلیم وتربیت، ادبی ماحول اور مقصد زندگی پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو حقیقت واضح ہو جائے گی۔ موصوف مدرسہ عالیہ (اورینٹل کالج) رامپور کے فاضل، الہ آباد بورڈ کے عالم، جامعہ اردو علی گڑھ کے ادیب کامل، مدرسہ عالیہ کے ممتاز علما اور مصنفین کے شاگرد۔ ۱۹۴۲ء سے شاعری کا شوق ہوا۔ ۱۹۴۳ء میں علامہ سیماب اکبرآبادی کی شاگردی اختیار کی اور ۱۹۴۵ء میں فارغ الاصلاح کر دئے گئے۔ رام پور اور دہلی کی مختلف علمی وادبی تنظیموں کے ذمہ دار اور معیاری رسائل واخبارات کے مرتب ومنیجر کی حیثیت سے برسہابرس کام کیا۔ بالخصوص دبدبۂ سکندری (رامپور) نئی نسلیں اور برادری (لکھنؤ) مومن (بدایوں) اچھا ساتھی (بجنور): رفت (دلی) وغیرہ۔ مزید یہ کہ عمر کا بیشتر حصہ مشہور دینی درسگاہوں (مرکزی درسگاہ اسلامی اور جامعات الصالحات رامپور) میں اردو، عربی زبان وادب اور حدیث وفقہ کی تعلیم وتدریس میں

صرف ہوا۔ ملک کی معروف دینی تنظیم جماعت اسلامی کی تحریک اور اس کے شعبۂ تعلیمات سے وابستہ رہے۔ غرض کم عمری سے ضعیف العمری تک پوری زندگی دین وتحریک اور علم وادب کی خدمت میں گزری۔ یہ وابستگی آج کے بہت سے دینداروں کی طرح '' ملازمانہ '' نہیں بلکہ قلبی اور والہانہ وابستگی رہی۔ اس علم وفضل اور دعوتی وتحریکی زندگی نے سماجی زندگی کے تضادات سے انہیں فکری وعملی دونوں سطحوں پر نبرد آزما رکھا '' سروساماں '' کے پیش لفظ میں اختر الایمان نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:-

'' معاشرہ اور شاعر ایک دوسرے کی ضد ہیں، یہی معاندانہ رویہ شعری تخلیقات کی بنیاد ہے۔''

شاعر کا قلمی نام، ابوالمجاہد ہی نہیں زاہد بھی ہے مگر زاہد خشک نہیں۔ انہوں نے اپنے عنفوان شباب میں ملک کی آزادی کے داغ داغ اجالے کو دیکھا اور تقسیم ملک کی قہرمانیوں کے بعد آزاد ہندوستان میں، سماجی، معاشی اور اخلاقی وانسانی اقدار کے بحران کا مشاہدہ کیا تو ان کے اندر کا '' زاہد اور علی'' حالات سے کشمکش کے لئے اٹھ کھڑا ہوا:

ہر حادثے نے مجھ کو دیا تازہ ولولہ
میں جس قدر دبایا گیا اور ابھر گیا

اب اس نور وظلمت کی کشمکش کے چند مناظر ملاحظہ ہوں:

یہ دورِ شمس و قمر یہ فروغِ علم و ہنر
زمین پھر بھی ترستی ہے روشنی کے لئے
کبھی اٹھے تھے جو خورشید زندگی بن کر
ترس رہے ہیں وہ تاروں کی روشنی کے لئے
رہِ حیات کی تاریکیوں میں اے زاہد
چراغِ دل ہے مرے پاس روشنی کے لئے

تحریکی زندگی نے تمام تر ذاتی وسماجی مصائب وآلام کے باوجود زاہد کو کبھی مایوس اور ہراساں نہ ہونے دیا بلکہ پرامید اور حوصلہ مند رکھا۔ ایک طرف آفاق کا یہ عالم ہے کہ:

وہاں یہ جشنِ بہاراں عجیب لگتا ہے
جہاں جلائی گئیں بستیاں گلابوں کی

مگر انفس کے رجائی انداز کی ولولہ خیزی ملاحظہ ہو:

ہم اپنے ساتھ لائے ہیں انوار زندگی
جب ہم نہ تھے کہیں بھی نہ تھی زندگی حسیں

کہیں پناہ نہ پائے گی ظلمت دوراں
زمیں پہ فصل اگے گی پھر آفتابوں کی

یہ حسن و زندگی کی رونق کڑی مشقت کے بغیر ممکن نہیں۔ شاعر کا تیور دیکھئے:

ہم تو ٹھہرے دھوپ کے راہی ہاں تم جاؤ سائے سائے

ظلمت شام بلا سے کیا ڈریں اے دوستو یہ تو صبح نو کے پرچم کے سوا کچھ بھی

جب دماغ اہل گلشن کے جلنے لگے لالہ و گل سے شعلے نکلنے لگے

یہ اور اس طرح کے پرنور اشعار تقریباً ہر صفحہ اور ہر غزل میں مل جائیں گے۔ اس سلسلے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ روشنی اور چمک کے مختلف ذرائع اور مختلف شکلوں کو شاعر نے مختلف داخلی و خارجی مناظر و کیفیات کو بڑے جمالیاتی انداز میں مختلف لفظوں میں حسب موقع و ضرورت استعمال کیا ہے۔ مثلاً شعلے، کرنیں، تنویر، فروزاں، چراغاں، آتش نمرود، شعلہ برق، دھوپ، ضیا وغیرہ۔ لطف یہ ہے کہ ان الفاظ کو نظم بھی نہیں غزل کے نازک صہبا میں بڑے سلیس و سہل ممتنع کے انداز میں نہایت روانی اور قادر الکلامی کے ساتھ جا بجا پیش کرنے پر وہ پوری قدرت رکھتے ہیں۔ آخر جو ٹھہرے داغ دہلوی اسکول (سیماب اکبرآبادی) کے تربیت یافتہ، مسئلہ محض ادبی تربیت کا نہیں بلکہ ابوالمجاہد زاہد کے فکر و نظر کی بنیاد اور اس کے پورے اٹھان کا ہے۔ موصوف کی دینی و علمی تعلیم و تربیت، رامپور جیسے تہذیبی شہر میں عمر کے بیشتر حصے کی عملی زندگی اور برصغیر کی ایک معروف دینی تحریکی تنظیم سے اوائل عمر سے آج تک ان کی گہری وابستگی کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن و سنت اور تزکیہ و تربیت کی روشنی نے ان کے فکر و اسلوب کو منور کر دیا ہے اس لئے جملہ اصناف سخن میں روشنی اور نور سے متعلق الفاظ و استعارات اور تلمیحات کا سیل بالکل فطری انداز میں بہتا رہتا ہے۔ قرآن و سنت کی بنیاد پر تصوف و تزکیہ کی ایک پوری تاریخ بھی انوار و تجلیات سے معمور ہے۔ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے نکات عجیبہ کے باب میں تصوف کی وجہ تسمیہ "نور معرفت اور توحید کے ذریعہ اپنے باطن کو جملہ آرائشوں سے پاک کرنے کی بنا پر ہے۔" ('حقیقت تصوف'، ڈاکٹر محمد طاہر القادری، لاہور، ص ۶۴)

علامہ اقبال کے لفظوں میں:

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

واضح ہو کہ زاہد کسی مریضانہ تصوف کے قائل نہیں، وہ تزکیہ وخدا پرستی میں 'کرامت' کی جگہ 'استقامت' کے قائل ہیں اور قرآن وسنت کی حقیقی اسپرٹ کو کہیں بھی دھندلا ناپسند نہیں کرتے، چنانچہ مجموعہ کلام ''ید بیضا'' کے باب 'حمد ونعت' کا آغاز حمد ونعت کے فرق جلی کو مٹانے کے نفی کرتے ہوئے صاف کہتے ہیں کہ:

نعت کو حمد بنانا نہیں آتا مجھ کو

اپنے دینی وعلمی مزاج کے سبب وہ جس بات کے قائل ہیں اسے ان الفاظ میں پیش کیا جاسکتا ہے:

دل بینا بھی کر خدا سے طلب ۔۔۔ کہ آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

''قرآن مجید'' کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ:

بحمد اللہ! جینے کا نیا ساماں نکل آیا ۔۔۔ گئی رات اور خورشید ضیا افشاں نکل آیا

اور کیوں نہ ہو کہ اسی قرآن پاک کی سورۃ النور کی نہایت جامع آیت (۳۵) میں خدائی نور کو ایک دلکش علامت کی صورت میں اس طرح پیش کیا گیا ہے:

''اللہ نور السموات و الارض مثل نورہ کمشکوۃ منھا ...... واللہ بکل شئی علیم

اللہ ہی آسمان زمین کا نور ہے، اس کا نور ایک ایسے طاق جیسا ہے جس میں ایک چراغ ہے وہ چراغ ایک فانوس ہے وہ فانوس گویا صاف وشفاف موتی کی طرح چمکتا ہوا ایک ستارہ ہے (اور) چراغ شجر مبارکہ زیتون (کے تیل) سے روشن رہتا ہے، جو شجر (زیتون) نہ مشرق کے رخ واقع ہے اور نہ مغرب کے رخ، اس کا تیل (اس قدر لطیف وشفاف ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ) اگر آگ اسے نہ بھی چھوئے تو بھی (خود بخود) بھڑک اٹھے گا (پھر ان منور فضاؤں میں عجب) نور پر نور (کا عالم ہے) اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کی راہ دکھاتا ہے اور اللہ لوگوں کو (سمجھانے) کے لئے مثالیں بیان فرماتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا (پورا پورا) علم ہے۔''

مفسرین میں ابن کثیر اور علامہ زمخشری وغیرہ نے وضاحت کی ہے کہ یہاں اللہ نے نور کی مثال مومن کے قلب سے دی ہے۔

یہ زاہد کی فکری وفنی خوش بختی ہے کہ ان کی پوری شاعری جلوہ نور سے معمور ہے۔ موصوف

کی اقبالی انداز میں رجائیت سے بھرپور ایک مختصر سی نظم ''ہم'' ملاحظہ فرمائیں:

ہم خاک کی معراج ہیں تقدیر زمیں ہیں
ہم اک غزل نور ہیں اک نظم حسیں ہیں
کیا ہم کو مٹائیں گے اندھیرے کے پرستار
ہم صبح یقیں، صبح یقیں، صبح یقیں ہیں
بدخواہ اجالوں کے اندھیروں کے پرستار
شرمندہ تھے، شرمندہ ہیں، شرمندہ رہیں گے
ہم صبح و مہہ و انجم و خورشید کی مانند
تابندہ تھے، تابندہ ہیں، تابندہ رہیں گے

اسی کو کہتے ہیں:

نسبت نور تو خود نور بنا دیتی ہے

یہیں پر ایک البیلے اور نئے لب و لہجے کے ترقی پسند شاعر جاں نثار اختر کی شاعری سے زاہد کی شاعری کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو دونوں کے فکر وفن کی انفرادیت اور پہچان ایک نئی آگہی عطا کر سکتا ہے۔ زاہد کے اسلامی نظریے کی طرح جاں نثار اختر بھی ترقی پسند فکر و نظر پر یقین کامل رکھتے تھے۔ اس راہ میں کئی طرح کے نشیب و فراز سے بھی گزرے، دونوں نے تقسیم ملک سے بہت پہلے شعر و سخن کا آغاز کیا لیکن بحیثیت مجموعی زاہد کے حالات نسبتاً سقیم ہوتے ہوئے بھی نظری فرق نے دونوں کے کلام کو بالکل دو رنگ دے دیا ہے۔ جانثار اختر کے یہاں نرمی اور بانکپن کے ساتھ مایوسی و محرومی کا بھی برملا اظہار ہے:

سوائے گرد ملامت ملا بھی کیا ہم کو
بہت تھا شوق زمانے کے ساتھ چلنے کا

ہر آن ٹوٹتے یہ عقیدوں کے سلسلے
لگتا ہے جیسے آج بکھرنے لگا ہوں میں

ہم نے انسانوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا
کیا برا ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے

روح کی پیاس کے آگے
جسم کی پیاس بڑی ہے

کس عقیدے کی دہائی دیجئے
ہر عقیدہ آج بے اوقات ہے

گھر میں پی لیں بھی تو کیا، آج بھی یاد آتی ہے
فرش مئے خانہ پہ وہ لغزش پا رات گئے

ان کے خیال میں آج انقلابوں کی گھڑی ہے اس لئے ہر "نہیں" ہاں سے بڑی ہے۔ چنانچہ آج آدمی کا وجود دیکھ کے "ہر فرد ایک سانحہ سا لگے ہے" آج ہر آدمی ادھورا دکھائی پڑتا ہے۔ کیوں کہ: نہ کوئی خواب، نہ کوئی خلش، نہ کوئی خمار۔ شاید اسی لئے ترقی پسند تنقید کے ایک اہم ستون ڈاکٹر محمد حسن نے جاں نثار اختر کی شاعری کی تمام تر جدت آفرینیوں کو بڑے عالمانہ انداز میں وضاحت کے بعد آخر میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ ان سب کے باوجود کیا وہ "اپنے پڑھنے والوں میں کوئی ایسی تبدیلی کر پائے یا نہیں جو اس کے نزدیک زندگی کی معنویت میں ردو بدل کر سکے..... ایسی تبدیلی جس میں آتش رفتہ کا سراغ بھی ہو اور آنے والی صبح کا نور بھی۔"

ایک اور بڑے محقق و نقاد خواجہ احمد فاروقی نے جاں نثار اختر کی غزلوں کا تفصیلی و تجزیاتی مطالعہ کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا اس کا خلاصہ آخر میں خود انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:-

"ان میں لطیف رومانیت ہے، جنسیاتی تحلیل ہے، شاعرانہ مصوری ہے
لیکن کوئی بیکراں جذبہ، کوئی دیوانہ بنا دینے والا احساس نہیں ہے۔"

مگر جاں نثار اختر کے مقابلے میں ابوالمجاہد زاہد کے یہاں تمام محرومیوں اور مصائب و آلام کے باوجود اپنے حدود میں "ایک بیکراں جذبہ" بھی ہے اور "دیوانہ بنا دینے والا احساس" بھی۔ تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ یہاں محض چند اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے:

دھوپ کے ماروں کو جس کی چھاؤں میں راحت ملے
ریگ زار زندگی میں وہ شجر ہو جایئے
لوگ چن لیں جس کی تحریریں حوالوں کے لئے
زندگی کی وہ کتاب معتبر ہو جایئے

کچھ تو تھے سنگیں حقائق کچھ حریری خواب تھے
بس کتاب زندگانی کے یہی دو باب تھے

تشنگی ہو تو ہر دشت سے
چشمہ آب زمزم ابلنے لگے

شرط ہے زاہد شعور منزل مقصود بھی
ہر ہجوم رہرواں کو کارواں کہتے نہیں

ایک ہو جائیں تو بن سکتے ہیں خورشید مبیں
ورنہ ان بکھرے ہوئے تاروں سے کیا کام بنے

خدا کی شان کہ ہم نے جنہیں تراشا ہے
وہ بت بھی شان دکھانے لگے خدا کی طرح

زندگی سے کچھ نہ دینے کی شکایت کیا کروں
سوچتا ہوں میں نے خود بھی زندگی کو کیا دیا

ہم غلامان محمد ہیں اجالوں کے سفیر
ہم نے ہر دور میں ظلمت سے بغاوت کی ہے

OO

ظفر اوگانوی کی کہانی

(۷۷ء سے پہلے اور ۷۷ء کے بعد)

ظہیر انور

اچھی کہانیاں ہمارے شعور کا حصہ بن جایا کرتی ہیں۔ کہانی کا موضوع، پلاٹ، ماجرا سازی اور مجموعی تاثر برسوں ہمارے ذہن میں زندہ رہتے ہیں۔ اور ہمیں بصیرت سے معمور کرتے رہتے ہیں نیز روح کو فرحت اور تازگی فراہم کرتے ہیں۔ ہمیں یوں احساس ہوتا ہے کہ کہانی کے گتھے ہوئے بیانیہ اور زمانی عرصہ میں ہم اپنی زندگی کا کوئی حصہ گزار آئے ہیں۔ اشفاق احمد کی ''گڈریا''، عبداللہ حسین کی ''ندی''، قرۃ العین حیدر کی ''نظارہ درمیاں ہے''، منٹو کی ''ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو، ہتک''، راجندر سنگھ بیدی کی ''اپنے دکھ مجھے دے دو''، عصمت چغتائی کی ''لحاف''، اقبال مجید کی ''دو بھیگے ہوئے لوگ''، جوگندر پال کی ''کھودو بابا کا مقبرہ''، غیاث احمد گدی کی ''خانے تہہ خانے''، سریندر پرکاش کی ''بازگوئی'' اور اس قسم کی دوسری کہانیاں اپنی کسی بے نام تہداری کے باوصف ہماری فکشن کی تاریخ اور ہماری مجموعی یادوں کا زندہ حصہ ہیں۔ ان کہانیوں میں ماجرا سازی سے لے کر بیانیہ کی روانی تک ایسی کوئی چیز موجود ہوتی ہے جس سے قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ کہانی کا کوئی سرا اس کے شعور سے جڑا ہے۔ وہ انجانی مسرت اور بصیرت سے مالا مال رہتا ہے۔ اس لئے ان ساری کہانیوں کے خدوخال کبھی مکمل طور پر مرجھاتے نہیں ہیں۔ ایک بار کہانی کی پراسرار اور متحرک دنیا سے ہمارا رشتہ بن جائے تو ٹوٹے نہیں ٹوٹتا۔ ہم فکر کی نئی دنیا سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ مغرب میں بھی موپاساں سے لے کر او ہنری تک، سارتر سے لے کر کافکا تک ایسی بے شمار کہانیاں ہیں جو زندگی میں ذرا بھی مماثلت پاتی ہیں تو لاشعور سے

اچھل کر ہمارے ذہن کے اسکرین پر تر و تازہ ہو جاتی ہیں۔

ایسی ہی فرحت اور مسرت کا احساس ہمیں اردو کی بہترین جدید کہانیوں کے حوالے سے میسر آتا ہے۔ جس کی ایک کڑی ہمارے بنگال کے افسانہ نگار ظفر اوگانوی ہیں۔ ظفر اوگانوی نئی کہانیوں کا ایک اہم دستخط ہیں۔ وہ ۱۹۶۰ء کے آس پاس نئی کہانی کے منظر نامے پر ابھرے۔ اس سے پہلے تو اپنے ارتقائی لمحوں میں انہوں نے روایتی طرز کی صاف، غیر پیچیدہ اور معمولی کہانیاں تخلیق کیں لیکن جلد ہی ان کی ترجیحات میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی اور وہ اپنی کہانیوں کے جدید رویے کی بنا پر نمائندہ افسانہ نگار بن گئے، بالخصوص ۱۹۷۷ء میں اپنے افسانوں کے مجموعے ''بیچ کا ورق'' کی اشاعت کے بعد وہ نئے اور تجربہ پسند افسانہ نگاروں کی صف میں نمایاں نظر آئے۔ ۱۹۷۷ء تک کہانیوں کے جتنے مجموعے شائع ہوئے تھے، ان میں ''بیچ کا ورق'' اپنے اسلوب، ہیئت، تکنیک، زبان و بیان کے نئے اور منفرد تجربے کی بنیاد پر نہایت اہم مجموعہ تھا۔ نئی کہانی کے قافلہ سالاروں میں بلراج مینرا، سریندر پرکاش، احمد ہمیش، انور سجاد، عوض سعید وغیرہ ایسے نام تھے جنہوں نے اپنی اندرونی میکانکس اور داخلی لینڈ اسکیپ، بیان کی انوکھی ترنگ، علامتوں، استعاروں اور پیکروں کے استعمال کے توسط سے کہانی کو نئے تجربے اور نئی تازگی سے ہمکنار کر رہے تھے۔ روایت سے بالکل مختلف طرز پر نئی روایت (Tradition of the New) کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ جدید افسانے میں موضوع اور تکنیک کا ذکر کرتے ہوئے فضیل جعفری نے نہایت متوازن خیال کا اظہار کیا ہے:-

> ''جہاں تک جدید افسانوں کے موضوع اور تکنیک کا سوال ہے، متعلقہ افسانہ نگاروں نے سماج سے باہر نہیں، انکے اندر ہی رہ کر افسانے لکھے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پیش روؤں کی طرح خارجی ماحول کی عکاسی کسی طے شدہ اور بنے بنائے سانچے کی مدد سے نہیں کی، اپنے داخلی لینڈ اسکیپ کے توسط سے کی ہے۔ نتیجے کے طور پر ان افسانوں میں ایک ایسی جارحانہ دانشوری پیدا ہوگئی ہے جسے سمجھنے اور ہضم کرنے میں قاری کو دشواری پیدا ہوتی ہے۔ نامانوس علامتوں، استعاروں اور پیکروں کے استعمال کا تعلق جدید افسانوں کی تکنیک سے ہے۔ یہ کہیں کہیں شارٹ ہینڈ والی تکنیک بن گئی ہے جس میں خالی جگہوں کو پر کرنے کا کام قاری خود کرتا ہے۔ جدید افسانوں میں غیر ضروری تشریح اور تفصیل سے احتراز کا رجحان ملتا ہے۔ بیانیہ

میں واقعات کوترتیب وار پیش کرنے کے بجائے انہیں فنی مہارت کے ساتھ
بالواسطہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔'' (اردو افسانے اور جدید افسانے)

اس اقتباس میں نہایت صفائی اور باریک بینی سے جدید افسانوں کے بنیادی نکات کو واضح کیا گیا ہے اور اس کا ذکر اس لئے بھی ضروری ہے کہ بیشتر ناقدین نے ان افسانوں کے علامتی، استعاراتی یا تجریدی طرز بیان کو یکسر رد کرتے ہوئے انہیں ''چیستاں'' کے سرد خانے میں ڈال کر اور جدید افسانوں کی اہم خصوصیات کو بھی لعنت ملامت کر کے اپنی بساط مختصر کر لی بلکہ ان افسانوں کے حقیقی مقام کو متعین کرنے سے بھی منہ موڑ لیا۔ آل احمد سرور جیسے بلند پایہ ناقد نے معاملے کو بہتر طور پر سمجھا تھا اور اس نتیجے پر پہنچے تھے:۔

''ایک بنیادی مفہوم میں علامت پسندی ہر دور کی خصوصیت رہی ہے۔
ہاں اس دور میں علامت کا استعمال شعوری ہے اور بالارادہ ہو گیا ہے۔
اسلئے (ناول اور) افسانے کو یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ترشے
ترشائے واضح، متناسب، صاف ستھرے روز روشن کی طرح عیاں فن کو
دھندلا، طلسمی، خواب آلودہ اور ہر شئے کو کچھ اور بنا دیتا ہے۔'' (اردو فکشن)

اردو فکشن پر سرور صاحب کی نظر گہری ہے۔ وہ صاف اشارہ کر رہے ہیں کہ علامتی اور استعاراتی کہانیاں طلسمی، خواب آلودہ یا کچھ اور نہیں بلکہ اپنے اس سماج کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ اگر ہم اپنے تعصب (Prejudice) اور ادعائیت (Dogmatism) سے دامن بچا کر ان نئی کہانیوں اور انکے بالواسطہ لہجے کو دردمندی سے سمجھنے کی کوشش کریں تو یہ کہانیاں اپنے موضوعات اور تکنیک کے سلسلے میں گہرے غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔

کہانی میں اظہار و اسلوب کی ایسی ہی سطح پر ظفر اوگانوی کی بھی بحیثیت افسانہ نگار شناخت بنی۔ ''بیچ کا ورق'' اور اس میں شامل گیارہ کہانیاں اپنی تخلیق اور تعمیر کے اعتبار سے تاریخ کے ایسے موڑ کی وہ کہانیاں ہیں جو اپنے داخلی انتشار کے علامتی اظہار کی بنیاد پر متنازع فیہ رہی ہیں۔ کہانی نے ساٹھ کے بعد کروٹ بدل لی تھی۔ بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ افسانہ کی ساخت، ہیئت اور تیور بھی بدل گئے تھے۔ چونکہ افسانہ تخلیقی عمل ہے اور اپنے جلو میں اپنے عہد کی زندہ، متحرک اور پیچیدہ حقیقتوں اور اس کے امکانات کو اسیر کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اور ہر دور کے اپنے مسائل کا در بھی اسی میں کھلا رہتا ہے اس لئے صنف افسانہ نے جب نئی دہلیز پر قدم رکھا تو اس کے مسائل بھی مختلف تھے۔ افسانہ نگار کی نگاہ میں ترقی پسند

تحریک کی ادعائیت اور اس کی خوبیوں کے علاوہ عالمی منظرنامے کی وسعت بھی تھی۔ ظفر اوگانوی نے بے خوف ہو کر اپنے پیش لفظ میں لکھا تھا:۔

> ''میرے لئے اردو کے وہی ناقد اہم ہیں جو بین الاقوامی ادبی سیاسی اور سماجی نظریات واقدار کی خامیوں سے آگاہ ہیں اور جنہوں نے خلوص دل کے ساتھ اسی پس منظر میں نئی کہانیوں کے آرٹ کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔''

(بیچ کا ورق)

ظفر اوگانوی کو احساس تھا کہ عالمی سطح پر تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ سماجی سطح پر نئی قدریں جنم لے رہی ہیں...... قدروں کی شکست و ریخت، تضاد سے بھری ہوئی مصنوعی تہذیب اور اس کے نتیجے میں بے اطمینانی، بکھرتا ہوا معاشرہ، فرد کی تنہائی، برگشتگی، انفرادیت اور حد سے بڑھتی ہوئی انا، ظاہر سے باطن کی طرف مراجعت...... یعنی زندگی بے کیف اور منتشر نظر آ رہی تھی اور بے سمت بھی، وجودیت، سوریلزم اور داداازم کے اثرات اور علامت نگاروں کی نگارشات سے ہمارے افسانہ نگار بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سائنسی ایجادات، سیاسی منافقت اور زندگی کی تیز رفتاری نے ان افسانہ نگاروں کے فوکس کو ظاہر کی سطح سے ہٹا کر باطن کی دنیا میں مرکوز کر دیا۔ نئی کہانی کے پروٹوگونسٹ اپنی ذات کے خول میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور اسی حوالے سے اپنی دنیا اور متعلقہ سماج کی حقیقتوں کا اظہار کیا ہے۔ یہ ایک نئے عرفان کی ابتدا تو تھی لیکن نئے کرب کی شروعات بھی یہیں سے ہوئی۔ احساس ذات کے پہلو بہ پہلو کرب ذات کے گھنے جنگلوں میں افسانہ نگاروں نے نیا سفر شروع کیا۔ اس تخلیقی اظہار میں فنکار کے تجربے کا کھرا پن بھی شامل تھا۔ فنکار تو اسی دنیا کا باسی تھا۔ صرف یہ دنیا اس کی ذات میں گم تھی یعنی اپنے داخلی لینڈ اسکیپ کے توسط سے افسانہ نگاروں نے اپنی ٹوٹتی پھوٹتی شخصیت کے ساتھ اپنے سماج کی بھی خبر دی۔ بس اظہار کے طریقے اور برتاؤ میں تبدیلی آ گئی۔ تجربہ پسندی نے اپنی جگہ بنالی۔ اب افسانہ ترشے ترشائے، شفاف بیانیہ کے حوالے سے تخلیق نہیں کیا جا رہا تھا اور نہ ہی روایتی طور پر ''روز روشن کی طرح عیاں'' تھا بلکہ اندرون ذات اور انکشاف ذات کے حوالے سے علامتوں، استعاروں اور پیکروں میں کہانیاں تخلیق کی جانے لگیں۔ بالواسطہ بیان نے پیچیدگی پیدا کر دی۔ شفاف بیانیہ اور فارمولہ زدہ پلاٹ کے عاشقوں نے ان کہانیوں کو ''انٹی اسٹوری'' کے نام سے بھی یاد کیا لیکن ان کہانیوں کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں انسان کے باطن کی تصویر کے ساتھ ساتھ کائناتی غم اور خوشی کا سر چشمہ بھی موجود ہے۔ لہٰذا تخلیقی اظہار

کے اس رویے میں نئے تجربے کے کھرے پن کے پہلو بہ پہلو تازگی اور فکری بالیدگی بھی موجود ہے اور اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہونا چاہئے۔

ظفر اوگانوی بنگال کی حد تک تو نئی کہانیوں کے سالار کارواں نظر آتے ہیں۔ کتابی صورت میں ''بیچ کا ورق'' کی اشاعت اس طرح کی کہانیوں کے سلسلے میں ظفر اوگانوی کو اولیت کا درجہ عطا کرتی ہے۔ ان کہانیوں میں انترا موریں سے لے کر ریس کے گھوڑے تک ساری کہانیوں کو پڑھ جائیے، آپ کو افسانہ نگار کے وجود کے اندر بسے ہوئے بے چین اور بے کل جہاں کا نظارہ دیکھنے کو ملے گا۔ ان کہانیوں کا ایک در افسانہ نگار کے باطن میں کھلتا ہے اور ایک در سماج، شہر اور سیاسی جبر کی تصویروں کی طرف کھلتا ہے۔ پیش لفظ کے طور پر لکھی گئی مختصر مگر جامع تحریر کا ایک جملہ افسانہ نگار کے موقف کو نہایت عمدگی سے بیان کرتا ہے:-

''اس ذہن کی کہانی جو آج کے اقتصادی، سیاسی اور سماجی تقاضوں کا ردعمل ہے۔'' (بیچ کا ورق)

مذکورہ بالا مختصر اقتباس اس بات پر دال ہے کہ افسانہ نگار سماج کا ہی پروردہ ہے۔ اس کے ذہن اور باطن کی تمام تر پیچیدگیاں اور بے چینیاں اسی سماج کے اقتصادی، سیاسی اور سماجی حالات کی زائیدہ ہیں۔ لہٰذا ظفر اوگانوی کی علامتی اور استعاراتی کہانیوں کے تجزیے سے ہمارے عہد کے ایک ایسے انسان کی تصویر ابھرتی ہے جو اپنے جسم اور عصر کے احاطے میں محبوس بے کل اور بے چین روح کے حوالے سے اس دور کی خوفزدگی اور ہراس، بے چینی اور انتشار نیز اپنی ریزہ ریزہ باطن اور قدروں کی شکست و ریخت کو عمدگی سے بیان کرنے پر قادر ہے۔ کہانی میں براہ راست اور روایتی طور پر منظر اور گٹھے ہوئے بیانیہ طریقہ کار سے اجتناب برتا گیا ہے لیکن قصے اور واقعات کو مسلسل بہاؤ کے ساتھ پیش کرنے میں افسانہ نگار نے اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ مخصوص علامتی اور پیچیدہ طرز اظہار کے تحت ریزہ ریزہ کائنات کی صورتحال کے ساتھ متعلقہ سماج کے جبر کو بھی زبان دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں چھوٹے چھوٹے Prisms سے فوکس کو شہری واردات پر رکھا گیا ہے۔ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگار نے صرف اپنی ذات کا مرثیہ ہی نہیں لکھا جہاں شناخت کا مسئلہ Recurring theme کی صورت جاری و ساری ہے بلکہ اس سماج کو بھی آئینہ دکھایا ہے جس میں وہ زندگی گزار رہا ہے۔

اب انکی ایک دو اہم کہانیوں کے متن کے مرتکز مطالعے (Close textual reading) کے حوالے سے تجزیہ کرتے ہیں تا کہ یہ ثابت ہو سکے کہ ظفر اوگانوی کی نئی کہانیاں کس حد تک نئی

کہانیوں کے مطالبات کو پورا کرتی ہیں۔ سب سے پہلے ان کی کہانی ''بیچ کا ورق'' ہی کو لیتے ہیں جو شخصی حیثیت کی ایک مثال ہے، جس کی اہمیت کے پیش نظر افسانہ نگار نے اسے اپنے مجموعے کا عنوان بھی منتخب کیا ہے۔ کہانی کی بنت کچھ ایسی ہے کہ انہیں بنگال کی سطح پر نئی کہانیوں کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ ظفر اوگانوی کی کہانی کا راوی منفرد حساسیت کے توسط سے کہانی بیان کر رہا ہے۔ کہانی کا اہم کردار بے نام ہے لیکن غیر روایتی اسلوبیاتی انداز میں اپنے باطن کے انتشار کی تاریخ کو افسانے کی طرح برتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مختصر پیکری انسلاکات کے حوالے سے اپنے عہد اور اپنے ماحول کی تعمیر کی ہے۔ ایسی کہانیاں اپنے طرز اور تکنیک، اپنی تمثیلی فضا بندی اور علامتی طریقہ کار کا انتخاب خود کرتی ہیں اور اپنے اندرونی ضبط اور زیریں لہروں کی بنیاد پر افسانہ نگار کے لئے Self-signature کا درجہ رکھتی ہیں۔ (اگرچہ ایسی نمائندہ کہانیاں بیشتر افسانہ نگاروں کے مجموعوں میں دو ایک سے زیادہ نہیں ہوتیں)

کہانی ''بیچ کا ورق'' کا بنیادی کردار ایک سات منزلہ عمارت کی بلندی سے بالکل ایسے ہی نیچے دیکھتا ہے جس طرح سارتر کی ایک کہانی میں کردار عمارت کی بلندی سے عام لوگوں کے قد کو ناپنے کی غرض سے پستی کی طرف دیکھتا ہے۔ واقعات کے بیان میں چھوٹی چھوٹی اکائیاں ابتدا میں بے ربط، نا قابل فہم، بے ترتیب اور ماورائے عقل نظر آتی ہیں۔ لیکن جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ کہانی میں ایک باطنی ربط موجود ہے۔ آس پاس کی ہوسنا ئل دنیا سے کہانی کا راوی متاثر ہوتا ہے لیکن وہ اپنی تنہائی میں بھی سر بلند اور شکست میں بھی اس کی انا کی دیوار اونچی ہے۔ افسانہ نگار کردار کے بیان میں ابتدا ہی میں یہ کہتا ہے:

''وہ اپنی بلندی میں بھی تنہا اور تنہائی میں بھی بے مثال ہے۔''

جدید آدمی کا یہ ذہنی رویہ ہے۔ ایسا کردار تفکراتی سطح پر بالغ اور بلند ہے وہ اپنی ہوشمندی کی قیمت مخالف رویے سے متصف دنیا میں چکانے پر مجبور ہے۔ لہذا اس کا تنہا ہونا بھی اس کے جینے کی ایک شرط ہے۔ آس پاس کی ''خاموش اور بے مفہوم'' فضا میں حبس ہے لیکن یہ تنہا کردار اپنے اندر ایک ایسی تپش رکھتا ہے جو سورج کو بھی پگھلا دے۔ ماحول جھلسا دینے والا ہے۔ ہوا رکی ہوئی ہے۔ کردار کی بالغ نظری کا عالم یہ ہے کہ آنکھوں میں منظر صاف ہے۔ تنہائی کی گرمی میں عمارت سیاہ ہو رہی ہے اور بے اطمینانی کے سائے لہرا رہے ہیں۔ یہاں سے علامت سازی گہری ہوتی جا رہی ہے۔ حبس زدہ ماحول میں کردار محصور نظر آتا ہے۔ اس آلودہ سماج میں کردار اپنی پسلی چاک کر کے اپنی زندگی کے پنے نکالتا ہے اور اپنے خون دل سے اپنے احساسات رقم کرتا ہے۔

''سورج رکا کھڑا ہے، ہوا ششدر ہے، لیکن وہ اپنے تجربات ان کاغذات پر تحریر کرتا جاتا ہے۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اوراق در حقیقت کردار کی زندگی اور اس کے عصر کی روداد نظر آتے ہیں بلکہ اس کی پوری کائنات ہی چاروں طرف جمع ہوگئی ہے اور اس کی ترتیب وتشکیل کا اہم مسئلہ درپیش ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ان اوراق کی اٹھتی ہوئی دیوار میں محبوس ہو جائے وہ اپنی پسلی کو اس کی مناسب جگہ میں پیوست کر دینا چاہتا ہے لیکن جب وہ اپنی ذات اور کائنات کے نہاں خانے میں نظر دوڑاتا ہے تو منظر کچھ یوں ابھرتا ہے:۔

> ''سمندر سوکھ چکے تھیں، پہاڑ پگھل رہے تھے، جنگلوں میں آگ لگ رہی تھی، تب ہی آنکھوں کے لمس کی شعاعیں نرم پڑنے لگیں۔ سورج مرتعش ہوگیا۔ زمین حرکت میں آگئی۔ اس پر بھی جب اس کے اندر ٹھنڈ کا احساس نہ جاگ سکا تو اس نے ایک لمبی سانس کھینچی۔ نتیجے میں ہوائیں سمٹیں اور ایک طوفان کی صورت اس کی طرف بڑھنے لگیں۔'' (بیچ کا ورق)

صاف ظاہر ہے کہ افسانے کا راوی عدم تحفظ کی فضا میں جی رہا ہے۔ ماجرا سازی کا طرز بھی انور سجاد، مینرا اور سریندر پرکاش جیسا ہے۔ زندگی اور فن کو برتنے کے طرز میں آواں گارد کا نظریہ جھلک رہا ہے(An avant garde view of life) لہجہ جدید ہے اور ایک نوع کے مترنم (Lyrical) بیانیہ میں کہانی کو تشکیل دینے کی شعوری کوشش ہے۔ پیکرات ایسے خلق کرنے کی سعی کی گئی ہے جن کے حوالے سے ذہنی تردد اور جذباتی پیچیدگیوں کو مختصر ترین وقفوں میں پیش کیا جاسکے جیسا کہ Image کی تعریف میں Ezra pond نے کہا تھا:۔

> "An image is that which presents an intellctual and emotional crisis in an instant of time."

ایسے بیانیہ میں کہانی کی تخلیق کے پہلو بہ پہلو اس کی رد کی صورت بھی نظر آتی ہے یعنی ایک نوع کا Deconstruction۔ چونکہ ہمارا افسانہ نگار اپنے افسانوی متن کی تشکیل سے علیحدہ نہیں بلکہ گہرے طور پر جڑا ہے لہذا اپنے اندرون ذات کے مسائل سے ایمانداری کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔ لہذا کہیں کہیں بے ربطی اور ظاہری غیر ہم آہنگی کے تناظر میں Deconstruction کا جواز پیدا ہوتا ہے۔

ہاں تو اپنی بلندی اور ذہانت کے باوصف وہ ان تمام اوراق کو یکجا کرنے اور ایک تسلسل میں پرونے کے لئے کوشاں ہوتا ہے کہ زمانے کہ ہوائیں یا افسانہ نگار کے امیج کے مطابق

بڑھتے ہوئے طوفان نے مزید مسئلہ پیدا کر دیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ تمام کاغذات کو سمیٹ کر اپنی زندگی کو معنویت کی دبیز تہہ میں چھپا لے، طوفانی یورش کی زد میں ایک صفحہ آ جاتا ہے۔ اس ایک صفحے یا ایک علامت کو اگر راوی کے مشاہدات اور تجربات پر منطبق کیا جائے تو یہ راوی کی زندگی کا نہایت اہم واقعہ قرار پائے گا۔ زندگی کے شب و روز بھی واقعات، حادثات اور سانحات کے طوفان میں اسی طرح بکھرتے جاتے ہیں، کبھی خاموشی کے پر اسرار لحن میں اور کبھی جلتی روشنی کی رفتار کی مانند، راوی اپنی زندگی، بلکہ اپنی ذات کے گہرے پاتال سے نکالے ہوئے اس ورق کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے مسلسل تگ و دو کرتا ہے۔ گہری اذیت کے بعد جب اس ورق کو عمارت سے کروڑوں دن کی مسافت کے فاصلے پر قابو میں کرنے میں کامیاب ہو کر اور پسلیوں کے شگاف میں محفوظ کر لینے کے بعد وہ لوٹتا ہے تو دیگر سارے اوراق اپنی جگہ پر محفوظ نہیں ہیں۔ شہر شہر، سڑک سڑک بکھر چکے ہیں۔ اس کے غصے کی انتہا نہ رہتی ہے، اس غصے نے سورج کو بھی پگھلا دیا ہے۔ (پوری طرز تحریر اسی طرح کے جدید لہجے کی گونج سے بھری ہے) تلاش کی آخری منزل پر اپنی زندگی کی شام وسحر کی تربیت و تسلسل کی خاطر ہراساں کردار نے دیکھا کہ یہ سارے اوراق اب اس کی پہنچ سے باہر ہیں۔ اس نے اپنی پسلیوں سے اس ایک ورق کو بھی نکالا، اس کے پرزے پرزے کئے اور ہوا میں اڑا دیا۔ اس کے ٹکڑے سڑکوں اور شاہراہوں پر بکھر گئے۔ انجام تک پہنچتے ہوئے افسانہ نگار نے نہایت ڈرامائی انداز میں کہانی کو سمیٹتے ہوئے ایک ایسی تصویر کھینچی جو نہ صرف New stylistic Age کی پیداوار ہے اور مسلسل چونکاتی ہے بلکہ خود کسی تصوراتی وقوعے یا مختصر فنتاسیہ کی غیر عقلی (Anti Rationality) اور اینٹی آرٹ (Anti Art) سی نظر آتی ہے۔ سارے اوراق اپنے ساتھی کی لاش اٹھائے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہر ورق پہلے ورق کے نام پر آگے بڑھ رہا ہے۔ بیان واقعہ اور تشکیل افسانہ کے لئے زبان کا استعمال بیک وقت رومانی اور غیر رومانی ہے اور اس طریقہ کار کو جدیدیت کی ایک نمایاں خصوصیت کا درجہ دیا جاتا ہے:-

> ''تب ہی اس نے دیکھا کہ وہ سارے ورق جو اپنے ساتھی کی تلاش میں چاروں اور پھیل چکے ہیں اس کے مکان کے پھاٹک سے باہر جوق در جوق کھڑے ہیں اور ہر ایک کا کاندھا اپنے ساتھی کی لاش کے ایک ایک ٹکڑے کا کرب سہہ رہا ہے۔'' (بیچ کا ورق)

یہاں بیانیہ بظاہر مزید پیچیدگی کا شکار نظر آتا ہے لیکن معنی کی تشکیل میں مانع نہیں ہے۔

ہر شخص اپنی اپنی لاش اٹھائے زندگی کے گھمسان رن میں کرب سہتا ہوا چل رہا ہے۔ کچھ ایسے ہی جدید انسان کا تصور محمد علوی کے اس شعر سے ابھرتا ہے:

کبھی اپنے اپنے جنازے میں گم　　کبھی اپنے ہونے پہ مغموم تھے

اس میں ترتیب و تسلسل کی تلاش بار آور نہیں ہوتی۔ راوی بھی آخری اور پہلے ورق کی تلاش میں ناکام لوٹتا ہے۔ آخر آخر سب کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ مایوسی قدر مشترک کی طرح ابھرتی ہے جو سارے انسانوں کی تقدیر ہے۔ پہلے اور آخری ورق کی تلاش کی منزل پر شاد کے اس شعر کی معنویت کی مدد سے پہچانا جا سکتا ہے جسے افسانہ نگار نے اپنے نظریہ زندگی کی توثیق کے لئے آخری صفحے پر درج کیا ہے:

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی　　نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اس طرح کہانی اپنی روایت سے رشتہ طے کرتے ہوئے اپنے مستقبل کی طرف گامزن نظر آتی ہے۔ کشف ذات کا معاملہ ہے لیکن عرفان ذات کی منزل ابھی آئی نہیں تاہم اندرون ذات کی کربناکیوں کا موثر بیاں ممکن ہوا ہے اور اس کی علامتیں ہوشمند قاری میں منتقل ہو پاتی ہیں۔ یہ ظفر صاحب کا کامیاب افسانہ ہے اور ایسا افسانہ کسی بڑے شہر میں ہی تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ دیگر کہانیوں میں شہر، شہر کی خوبیاں اور سفاکیاں وقفے وقفے سے جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ظفر اوگانوی کا ذخیرۂ الفاظ شگفتہ، تازہ اور کہیں کہیں Explosi.e ہے لیکن قاری کو افسانہ کے ساتھ ساتھ باندھے رکھتا ہے۔ انکے انداز بیان سے احساسات و جذبات میں ایک نوع کا تحرک پیدا ہوتا ہے اور کردار اپنی کہانی سے نکل کر کبھی کبھی قاری کے ساتھ چلنے لگتا ہے، اور تھوڑی دیر وقت گزار جاتا ہے۔ اگر چہ کہانی کا اختتام ایک حد تک میلوڈرامائی ہے لیکن اس طرح کا اختتام جدید کہانیوں کا خاصہ ہے۔

اس مجموعے کی دیگر کہانیاں بھی نئی کہانیوں کے زمرے میں آتی ہیں اور اپنے اسلوب، تکنیک، زبان و بیان کے حوالے سے افسانہ نگار کے باطن کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ قومی اور بین الاقوامی سطح پر ٹوٹتی بکھرتی قدروں کو بھی اسیر کرتی ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ جدیدیت کو بین الاقوامیت سے مشابہ قرار دیا جاتا ہے:-

"Modernism is infact, synonymous with internationalism"

(A Alvarez, quoted in'the name or nature of modernism')

اس مجموعے کی ایک نہایت اہم کہانی ''قیادت'' ہے۔ اس کہانی میں بھی سماج اور سیاست

کی زوال آمادگی کی تصویر کے ساتھ ساتھ انسان کے عدم تحفظ اور اذیت آمیز مجبوری کی نوحہ خوانی کی گئی ہے۔ کہانی میں موجود غیر یقینی کی فضا نے ''قیادت'' کی اہمیت کو دوبالا کیا ہے۔ افسانے کے کردار ایک ایسے ماحول میں جینے کیلئے مجبور ہیں جو نہ صرف معاشرتی سطح پر انحطاط پذیر ہے بلکہ جہاں ہر شخص کی شناخت کھو چکی ہے۔ یہاں تک کہ راوی بھی اپنی شناخت کی تیلی کیلئے ہراساں ہے۔ پہچان کی منزل تک رہنمائی مشکل ہے۔ کس کی قیادت میں اس کھائی تک پہنچا جائے؟ یہی پہچان تو قیمتی خزانہ ہے۔ یہ معاملہ صرف راوی کا نہیں بلکہ پورے مجمع کا ہے۔ ۔ بوڑھا شخص جو اپنی تیلی گپھا میں رکھ آیا ہے، پہچان سے خالی ہو گیا ہے لیکن پہچان کی اس تیلی کو واپس لانے کیلئے اس کھائی تک پہنچنا آسان نہیں ہے۔ راہ پر خار ہے، اندھیرا گھنا ہے، پھسلن ہے، اس کھائی میں روشنی بھی نہیں۔ بے اعتباری کی فضا میں بوڑھے کی قیادت بھی مجمع کو منظور نہیں۔ اسے مار ڈالا جاتا ہے۔ سارے مجمع کو خطرات سے آگاہ کرنے والے شخص کی قیادت میں آگے کھائی تک پہنچنا ہے لیکن ''اندھیرے میں اگلا قدم'' کہیں بھی پڑ سکتا ہے۔ سب کے سروں پر موت ناچتی ہے۔ لیکن سارے لوگوں کی پہچان کو سر پر رکھ کر وہ شخص اندھیرے میں داخل ہو جاتا ہے اور بقیہ لوگ بوڑھے آدمی کی لاش کی قیادت میں واپس لوٹتے ہیں۔ یعنی سارا مجمع بے شناخت اور حقیقی قیادت سے محروم ہے۔ فرد اور سماج دونوں کی قسمت پر بے چینی، کسمپرسی، شناخت کی محرومی اور اندھیرے پن نے اپنی سیاہی پوت دی ہے۔ قیادت سے محروم تمام لوگ اپنی پہچان، اپنے خزانے اور سماج کی اعلیٰ قدروں کی حفاظت کے علم سے بھی بہرہ ور نہیں ہیں۔ علامتوں اور استعاروں سے تعمیر کی گئی اس کہانی میں وہ روانی اور بیانیہ لہجے میں وہ بہاؤ نہیں جو ''بیچ کا ورق'' کا خاص وصف ہے تاہم ''قیادت'' جدید افسانے کی تکنیک اور مواد کی حد تک نمایاں کہانی نظر آتی ہے۔

اس طرح ان کی کہانی انترا موریس، نیا آئینہ، کھوپڑیوں کے سوداگر اور ریس کے گھوڑے میں بھی معنی کی کئی سطحیں آباد ہیں۔ ''انترا موریس'' میں کردار اپنے ہی خول کے اندھیرے میں گم اپنے وجود کا اسیر ہے۔ اپنے وجود کا یہ قیدی اپنے باطن کی کائنات کا بیان ایک نوع کے تجریدی انداز میں کرتا ہے اور اپنی تلاش میں خود ہی اپنے ''میں'' کو کھرچتا رہتا ہے اور دھیرے دھیرے جدید انسان اور اس کی ذاتی کشمکش کا ہیولا کہانی کے بنیادی اسٹرکچر سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس طرح ریس کے گھوڑے، گھوڑے کی ٹاپوں اور شہر میں ان کے جنون اور پاگل پن کے حوالے سے ایمر جنسی کی لعنت اور سیاسی جبر پر اچھی کہانی بن پائی ہے۔ پورا شہر بے پناہ ہو رہا ہے، خوف اور دہشت کا ماحول کھل کر سامنے آیا ہے۔ اسی طرح ''گھوڑے کے سوداگر'' میں صارفی سماج اور

اگلی دہائی کی منڈی کے مضمرات کو گہرے طنز کے ساتھ افسانے کا روپ دیا گیا ہے۔ طنز کے نشتر اس قدر گہرے ہوتے ہیں کہ ہمارے سماج کے اصلی روپ سے خوف آنے لگتا ہے۔ اس کہانی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو، جو آزادانہ طور پر پھیلی مادیت پرستی، دہشت، اندھیرا اور عدم تحفظ کا رواں استعارہ بن گیا ہے:-

"روشنی ہو جاتی ہے وہ چاروں اور دیکھتے ہیں اور خود کو ہلکا محسوس کرنے کے بجائے غم میں ڈوب جاتے ہیں کہ ان کھوپڑیوں کی بولی اور اگلی دہائی کے منڈی کے درمیان پھر ایک سورج آگیا۔ اب اسکے ڈوبنے کے وقت تک ہمیں اپنے سروں کی حفاظت کرنی ہے کہ سورج ڈوبے گا رات ہوگی اور منڈی کا کاروبار شروع ہوگا۔" (کھوپڑیوں کے سوداگر)

یہ تو اگلی دہائی کی منڈی کا منظر ہے۔ اگلی صدی کی منڈی نے تو انسان کی معصومیت کو بھی کھالیا ہے۔ اب چاہ کر بھی انسان اپنے خصوصیات کی حفاظت کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ بڑے تاجر چھوٹی مچھلیوں کو بآسانی نگلتے رہتے ہیں۔

مجموعے کا ایک اور اہم افسانہ "نیا آئینہ" ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے باطن کی دنیا کی بے چین فضا کی نہایت بلیغ تصویر کھینچی ہے۔ اس افسانے میں کئی کردار آتے ہیں، راوی، اس کا بچہ، بیوی یہاں تک کہ اس کے دوستوں اور اپنوں کا ذکر بھی ہے۔ یہ سارے لوگ پرانے آئینے کے سامنے یاد کی سطح پر گزرتے جارہے ہیں۔ آئینہ کا پالش اتر چکا ہے۔ بہت پرانا ہو چکا ہے، اسی طرح ہر منظر، ہر رشتہ، بلکہ ہر لمحہ جو گزر چکا ہے، اپنا نکل کھو چکا ہے۔ راوی تنہا ہے، سگریٹ پر سگریٹ کے کش لیتا ہے۔ بے چینی اور بے اطمینانی میں ایش ٹرے کی حالت بھی قابل رحم ناگفتہ بہ ہے۔ گہری اور بے چین رات میں تنہائی کو دور کرنے کی ساری کوششیں ناکام نظر آتی ہیں۔ نئے پن کی چاہ نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ بس آئینہ جو پرانا ہے، اس کے ٹوٹنے میں ہی عافیت ملتی ہے لیکن نیا کچھ ملا یا نہیں یا صرف خواہشوں کا جال پھیلا رہا، اس کی تہہ تک پہنچنا قاری کی ذہنی صلاحیت اور اس کی علامت فہمی پر منحصر ہے۔ کہیں کہیں افسانہ نگار نے اپنے اندرونی لینڈ اسکیپ کے اندر داخل ہونے کے لئے دراڑیں چھوڑ رکھی ہیں:-

"اب میرا کمرہ ایک ڈکشنری بن چکا ہے جس میں الفاظ اور ان کے معنی کسمپرسی اور بے بسی کے عالم میں منجمد پڑے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی مسیحا آئے اور ان لفظوں میں روح پھونک دے۔ پھر یہی لفظ اڑنے

لگیں، چہچہانے لگیں، کبھی یہ شاہین بن جائیں اور پہاڑوں پر بسیرا کریں،
یا کبھی ابابیل بن کر اپنے ننھے منے پنجوں میں ایک ایک کنکری لے جائیں
اور اصحاب فیل کے لشکر پر برسائیں۔" (نیا آئینہ)

دیکھئے کہانی کی فضا میں کیا ذہنیت کارفرما ہے اور متن پر علمیاتی (Epistemological) اور مذہبی اسطور کا کس طرح تطابق کیا گیا ہے۔ فکر کی ایک جہت کردار کے باطن کی طرف ہے تو ایک جہت سماج کی خامیوں کی طرف بھی خفیف سا اشارہ کر رہی ہے۔ یہاں زندگی کا تجزیہ بھی ہے اور زندگی سے فرار کی ایک صورت بھی کارفرما ہے اور یہ باتیں جدید افسانے کے بنیادی اسٹرکچر میں بھی پنہاں ہیں۔ James Mcfarlane نے جدیدیت کا ذہن، نامی مقالے میں Hugo Von Hofmannsthal کے حوالے سے لکھا تھا:-

"Modern means analysis, reflection, a mirrored image
or it could mean escape, fantasy,a dream image"

(Modernism,pg,71)

تو پتہ یہ چلا کہ نئی کہانی میں سطحیت کی جگہ تہداری آجاتی ہے اور متن پر ماضی کے اہم استعارات اور اسطور سے فضا بندی کی جاتی ہے تو کہانی ہمارے فکشن کی تاریخ کا حصہ بننے کا جواز رکھتی ہے نیز کہانی کا تخلیقی پیٹرن اور مواد اپنی خارجی پیچیدگیوں اور علامتوں کے باوجود نہایت موثر ثابت ہوتے ہیں۔ اگرچہ اکثر کہانیوں میں موضوعی یکسانیت یعنی شناخت کا مسئلہ اور شئے کی حقیقت کو دیکھنے کا طریقہ بار بار پلٹ کر کہانی میں واپس لوٹتا ہے تاہم کہانی کی زبان کو تخلیقی سطح پر کامیابی سے برتا گیا ہے بلکہ کئی مواقع پر کہانی کے بیحد جذباتی موڑ پر آجانے کے باوجود کہیں لفاظی ہے نہ عامیانہ پن۔ کردار کی ذہنی زندگی کے اظہار میں بیانیہ کی قوت معنی کی کئی سطحوں کو چھوتی نظر آتی ہے۔ کہانی کا ہر قاری اپنے طور پر کہانی کے مفہوم اور علامتوں کی حقیقت کو سمیٹنے کی کوشش کر سکتا ہے لیکن آخر آخر وہ ایک ہی نتیجے کی طرف پہنچتا ہے یعنی شئے کی حقیقت اور شناخت کا مسئلہ جو ظفر اوگانوی کی کہانیوں کا بنیادی اثاثہ ہے۔ افسانہ نگار کی داخلی شخصیت، اس کے نجی تجربات کہانی کو تہدار معنویت سے معمور کرتے ہیں۔ دیگر کہانیوں میں شہر اور بھی مرکزی حیثیت اختیار کرتا ہے اس لئے کہ دنیا بھر کی جدید کہانیوں کی طرح ظفر اوگانوی کی کہانیاں بھی شہر کی پیچیدگیوں کا راست نتیجہ ہیں۔ جدید تحریک جن شہروں میں پروان چڑھی، یعنی، پیرس، لندن، برلن، زیورک شہر کے افسانوی کردار سے ہم سب واقف ہیں۔ اس مجموعے "بیج کا ورق" میں بھی ایسی

کہانیاں ہیں جن کی کھڑکیوں سے شہر کلکتہ اور اس کی تہذیبی اور سماجی زندگی کا منظر صاف نظر آتا ہے۔ بالخصوص ان کی کہانی ''اپنا رنگ'' میں یہ مہا شہر پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

مختصراً یہ کہا جاتا ہے کہ ''بیچ کا ورق'' میں ایسے افسانے ہیں جن میں نئے انسان کے باطنی لینڈ اسکیپ کی روداد نہایت بلیغ انداز میں پیش کی گئی ہے جو روحانی اذیت میں مبتلا ہے اور اپنی شناخت کے مسئلے سے نبرد آزما ہے نیز وسیع تر سماجی، سیاسی اور تہذیبی موضوعات سے بھی ان کہانیوں کا ایک سرا جڑا ہے جہاں قدروں کی شکست و ریخت میں انسان کی زندگی میں فکر و غم کو متحرک کر رکھا ہے۔ استعاراتی بیان اور جدید تکنیک کے باوجود یہ کہانیاں فیشن زدگی کا شکار نہیں ہیں بلکہ تاثر کی شدت، اور کہانی پن کے سلسلے میں کہیں بھی کمی محسوس نہیں ہوتی اور یہ ظفر اوگانوی کا کم بڑا کارنامہ نہیں ہے۔

لیکن جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ظفر اوگانوی کی ترجیحات میں بھی تبدیلی رونما ہوتی رہی ہے۔ لہٰذا آٹھویں دہائی کے آس پاس ان کی کہانیوں کی بنت اور تکنیک میں ایک بار پھر تبدیلی آئی ہے۔ ۱۹۷۷ء میں شائع شدہ افسانوی مجموعے میں ہم نے روایتی پلاٹ، کردار، بیان، یہاں تک کہ مکالمے کے مروجہ اسلوب سے انحراف دیکھا تھا۔ اپنے افسانوی دور کے اس موڑ پر افسانہ نگار کے وجود کے باطن میں ہی سارا جہاں آباد نظر آتا تھا، اور راوی کے ہونے کا، اس کے کرب کا، اس کی ریزہ ریزہ ہستی اور زمانی عرصے کے بیان میں پیچیدگیوں کا احساس غالب ہے لیکن آٹھویں دہائی کے بعد ظفر اوگانوی نے جو افسانے لکھے ان میں کردار، پلاٹ، کہانی کی تنظیم، واقعات کے ربط میں مزید استحکام نظر آتا ہے۔ اس آخری دور کی کہانیوں میں فاصلہ، کرید، پہلا وار، لہولہو احساس، بے وزنی، کاگا چن چن کھائیو، نکلا جو حرف دعا، پہلوٹی کا کرب، تلافی، قصہ ایک مجسمے کا اور اس سے پہلے کے دور کے قریب قریب لکھا گیا ایک افسانہ جنگل میں اندھیری رات کا سفر، اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کہانیوں میں پلاٹ گٹھا ہوا ہے۔ پیرایۂ بیان میں دل نشینی ہے، واقعات کے تسلسل میں بہاؤ ہے اور قاری کو کسی طرح کی ذہنی ورزش کی ضرورت پیش نہیں آتی اور نہ ہی کہیں اکتاہٹ یا بوریت کا احساس ہوتا ہے۔ ہر کہانی میں بیانیہ واقعے کو نہایت مربوط صورت میں پیش کرتا ہے اور کہانی کی تعمیر میں کردار کو کسی شعوری کوشش کے ذریعہ خلق کرنے کے بجائے انسانی رشتوں، تجربوں اور زندگی کے مختلف رنگوں کے تخلیقی اظہار میں روانی کے ساتھ برتا گیا ہے۔ بحیثیت فنکار اپنی کہانی کے ہر دور میں ظفر اوگانوی نے تبدیلیوں کا ساتھ دیا لیکن کہانی میں قصہ پن سے رشتہ برقرار رکھا ہے۔ بعد کی

کہانیوں میں یہ خصوصیت حیرت انگیز طور پر ثمر بار ہوئی ہے۔ یہ کہانیاں پلاٹ اور کردار کی تخلیقی تنظیم سے وجود میں آئی ہیں۔ ان کی جدید کہانیوں میں ذات اور سماج کی جو شبیہ ابھرتی تھی اس کے اظہار میں اسلوب، تکنیک اور زبان کی سطح پر علامتیں اور معنوی تہداری کی سطحیں نمایاں تھیں، ذات کے خول اور انا کی جس عینک سے افسانہ نگار نے سماج اور گردوپیش کے مسائل کو دیکھا اور برتا تھا، اس میں ایک نوع کی پیچیدگی اور کہیں کہیں سر کے اوپر سے گزر جانے والی کیفیت موجود ہے۔ پلاٹ، مختصر کردار، داخلی موسم کا ذکر تو ہے لیکن ان افسانوں میں قاری کی فہم کہیں دھوکہ کھا سکتی ہے۔ اس کی شرکت کبھی ہوتی بھی ہے اور کہیں نہیں بھی ہوتی ہے کہ افسانہ نگار کائنات کو سمجھنے کا اپنا طریقہ رکھتا ہے لیکن ان کی بعد کی کہانیوں میں شفاف بیانیہ کی طرف مراجعت کا صاف پتہ چلتا ہے۔ یہاں صرف بیان کی سطح پر ہی نہیں بلکہ پلاٹ اور کردار، موضوع اور اسلوب کی سطح پر بھی صفائی اور دل نشینی برقرار رہتی ہے۔ قاری روز ازل سے جس شئے کو کہانی پن سے تعبیر کرتا آیا ہے، وہ شئے ان کہانیوں میں موجود ہے۔ ہر کہانی ایک دوسرے سے مختلف، ہر کہانی کے برتاؤ میں انفرادیت، علامتوں اور استعاروں سے مکمل طور پر رشتہ منقطع کرنے کے بجائے کہانی کار اپنے اندرون ذات کی تحویل سے ابھر آیا ہے تاکہ اشارے کنائے کا استعمال ہو تو کہانی شفاف اور قابل فہم انداز میں تعبیر ہو، اور قاری کا تجسس بھی برقرار رہے۔ اس نئے دور کے افسانوں میں واردات اور واقعات کے بیان میں زندگی اور انسانی رشتوں کے مختلف رنگوں کی پرکشش تصویر نظر آتی ہے۔ احساسات اور جذبات کو سلیقے اور فنکاری سے پیش کیا گیا ہے۔ ماحول سازی میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا بلکہ دھیرے دھیرے کسی خیال کو، زندگی کی مختصر تصویر کو، احساسات کے کسی رنگ کو ہمارے سامنے اپنے لازمی اختتام اور اپنی ممکنہ ابتدا کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر کہانی پن اور ایک نوع کی تکنیکی سہولت کے طور پر افسانہ نگار کہانی کو کبھی اختتام سے شروع کرتا ہے، کبھی سوالیہ مکالمے سے ابتدا کرتا ہے اور کبھی درمیان سے فلش بیک کے صورت پیش کرتا ہے۔ کہانی بظاہر جتنی سادہ شفاف اور فارمولا زدہ نظر آتی ہے، درحقیقت ویسی ہے نہیں، کہانی کی تہہ میں اتر کر دیکھیں تو روایتی شفاف بیانیہ اور گٹھے ہوئے پلاٹ کے کیموفلیج میں افسانہ نگار ظفر اوگانوی اپنی تخلیقی وژن اور زاویہ نظر صاف نظر آتا ہے۔ اب وہ کم سے کم لفظوں میں گہری معنویت اور تجربے کے کھرے پن کو کہانی کی صداقت بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ساری کہانیاں مختصر کینوس کی کہانیاں ہیں تاہم ان میں سے کچھ کہانیوں کا مجموعی تاثر اس قدر شدید ہے کہ انسانی صورتحال کی خوبصورت تمثیل بن گیا ہے۔

کہانی ''نکلا جو حرف دعا'' کو ہی لے لیجئے۔ یہ ایک بھکارن کی کہانی ہے جو شہر کلکتہ کے ایک خاص علاقے میں بھیک مانگا کرتی ہے۔ کہانی کار روز آتے جاتے اس بھکارن کو دیکھتا ہے، اس کے منہ سے دعائیہ الفاظ کبھی نہیں نکلتے، وہ ہر آنے جانے والے کو کوستی رہتی ہے، یہی اس کی پہچان ہے۔ کہانی کا راوی بھی اس کی گالیوں کا عادی ہو چکا ہے۔ پلاٹ کی تشکیل میں دفتر کا ذکر بھی آتا ہے جہاں کہانی کار راوی اپنے ساتھی سے بھکارن کی گالیوں کا ذکر کرتا ہے۔ افسانہ نگار نہایت مہارت سے دفتر کے اس ساتھی کے حوالے سے راستے کی بھکارن ماں اور اسکے رویوں کو ہندو اسطور سے جوڑ کر متن کی تعمیر میں معنی کی مزید تہیں پیدا کر دیتا ہے۔ جب دنیا میں ظلم اور استحصال بڑھ جاتا ہے تو ماں پربتی کالی کا روپ دھار کر ظالموں اور مجرموں کا صفایا شروع کر دیتی ہے۔ روزمرہ کا یہ ایک واقعہ جو بظاہر معمولی نظر آتا ہے، اسطور سے منسلک ہو کر کہانی کے سیاق میں وقت حاضر کا تانا بانا بن دیتا ہے اور کہانی آج سے منسلک ہو جاتی ہے۔ کہانی آگے بڑھتی ہے۔ راوی/افسانہ نگار دھرمتلے سے بالی گنج جانے والی ٹرام میں بیٹھتا ہے اور اسی مقام پر اترتا ہے جہاں بھکارن بھیک مانگا کرتی ہے لیکن آج اس کی آواز نہیں ابھرتی۔ اس کی گالیوں سے کانوں میں سیسہ نہیں پگھلتا بلکہ سارا منظر بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ پٹرومکس کی روشنی بتاتی ہے کہ بڑھیا گزر چکی ہے۔ یہاں بھی بڑھیا کی شناخت کا مسئلہ سوالیہ نشان چھوڑ جاتا ہے۔ گہرا سناٹا ہے اب اس کی جگہ نئی بھکارن نے لے لی ہے لیکن گالیوں کے بجائے خیر و برکت کی دعا سے بھیک مانگ رہی ہے۔ کیا یہ بھکارن اس بڑھیا کا نعم البدل ہو سکتی ہے یا پھر زمانے کی عیاری کی تمثیل بن چکی ہے؟ راوی/افسانہ نگار اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور پیسہ دینے کے بجائے آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ ایک بسی بسائی کہانی لگتی ہے۔ یہاں پلاٹ بھی ہے، مکالمے بھی ہیں، کردار بھی ہے، فضا بندی بھی مکمل لگتی ہے اور معنی خیزی کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ افسانہ نگار بھکارن کی گالیوں میں آسودگی اور سچائی کا احساس پاتا ہے جو کہیں اور کسی اور میں نہیں ہے۔ بھکارن کی آواز اور کردار میں ایک سچائی نظر آتی ہے۔ وہ بے غرض اور بے خوف بھی ہے۔ وہ اصلی ہے اور ظالم دنیا کے لئے تازیانہ بھی ...... کہانی کا مجموعی تاثر نہایت عمدہ ہے اور کہانی خوبصورت مختصر کہانیوں میں جگہ پانے کا جواز رکھتی ہے۔ کہانی کی تہداری اور ماجرے کا سیدھا بیان دل کو چھو لیتا ہے۔

ایک مختصر کہانی ''بے وزنی'' ہے جو ظفر اوگانوی کی پر اثر مختصر کہانی نظر آتی ہے۔ راوی اپنی شریک حیات کو قبرستان پہنچا کر تنہائی کے کربناک احساس سے بکھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ عمر کی شام تک پہنچے ہوئے دو معمر کرداروں کے گرد یہ کہانی گھومتی ہے جو اپنی ہی موت کے انتظار میں

زندگی کے بقیہ شب و روز گزار رہے ہیں۔ دونوں نے طے کیا ہے کہ مرنے سے پہلے ایک دوسرے کے لئے ٹیپ ریکارڈ پر اپنی خواہش ریکارڈ کر جائیں گے کہ ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں وہ ایک دوسرے سے کیا چاہتے ہیں۔ تمام لوگ رخصت ہوتے ہیں، رات ہوتی ہے، کردار اپنی بیوی کے کیسٹ کو آن کر کے سنتا ہے لیکن سوائے کیسٹ کی گھر گھر کی آواز کے اور کچھ سنائی نہیں دیتا۔ وہ خلا میں بے وزن وجود بن کر ڈولنے لگتا ہے۔ بزرگ لوگوں کی نفسیات پر یہ ایک بامعنی کہانی ہے۔ دونوں کرداروں کی ساری معنویت ایک دوسرے کے ساتھ رہنے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ Share کرنے میں مضمر ہے۔ لیکن جب بوڑھا تنہا رہ جاتا ہے تو بے معنی، لایعنی، بلکہ عدم وجودیت کے احساس کا شکار ہو جاتا ہے۔

ان کہانیوں میں ایسی کہانیاں بھی ہیں جن میں کوئی حقیقت یا کسی خیال اور واقعہ کو افسانوی روپ دینے میں علامت استعارے اور پیکروں کا سہارا لیا گیا ہے لیکن ان کہانیوں کے شفاف بیانیہ میں انفرادی فکر اور ذہنی و نفسیاتی سطح پر ایک گہرا احساس پایا جاتا ہے، مثلاً لہو لہو احساس، فاصلہ، وغیرہ۔ لیکن یہ کہانیاں قاری پر بہت گہرا اثر نہیں چھوڑ پاتی ہیں۔ انکے مقابلے میں ایک ذرا پرانی کہانی مثلاً جنگل میں ایک رات کا سفر (۱۹۷۷ء) میں جذبات و احساسات کا بیان اور تکنیک و اسلوب کی تدبیروں کی سطح پر وہی ہنر مندی سامنے آتی ہے جو "بیچ کا ورق" کے افسانوں کے علامتی یا تمثیلی طریقہ کار میں پوشیدہ ہے۔ یہ ظفر اوگانوی کا نمائندہ افسانہ ہے جو ان کی نسل کے لکھنے والوں کے تہہ دار اسلوب سے قریب ہے۔ یہاں بامعنی تجربہ پسندی اور علامت سازی متوازن صورت حال میں ہمارے سامنے ظہور پذیر ہوتی ہے اور کہیں بھی کہانی فیشن زدہ تجرید کے دھند لکے میں کھوتی نہیں ہے۔ کہانی کے ہر موڑ پر جنگل کا سماں ہے۔ ابتدا میں جنگل کا جو منظر کھینچا گیا ہے وہ ہیبت ناک ہے اور اسی فضا میں کردار کی خود کو بچانے کی فکر اور ساری تدبیروں کے ناکام ہونے کا احساس قاری کے شعور سے گہرے طور پر وابستہ ہو جاتا ہے۔ اندھیرا دور ہوتا نہیں کہ صبح کی روشنی میں یہ دیکھا جا سکے کہ وہ کہاں ہے۔ سنگین راستے، خاردار جھاڑیاں، پتھر، گدلا پانی، کیچڑ، ایسے میں اگلا قدم رکھنے کا سوال اہم ترین ہے۔ ماحول غلاظت سے بھرا ہے، ہوا میں بدبودار جھونکے ہیں، اچھلتے کودتے جانور ہیں، جھانکتی ہوئی آنکھیں ہیں، رات ہے اور جنگل کی دنیا ہے، شاخوں پر آنکھیں جھول رہی ہیں، خطرات ہیں اور پھسلن ہے، کہیں کچھ بدلا ہوا نہیں ہے، سارا معاملہ اگلے قدم کا ہے۔ یہاں بھی حیرت انگیز طور پر محمد علوی یاد آتے ہیں:

کبھی اپنے اندر اتر کے تو دیکھو گھنے جنگلوں سے گذر کے تو دیکھو

اس عہد کی شاعری، مصوری بلکہ کتابوں کے سرورق کے خاکوں میں اس طرح کے بیشمار استعارے موجود ہیں۔ افسانہ نگار جزئیات پر گہری نظر رکھتا ہے اور جنگل کی فضا میں خوف، دہشت اور ہراس کے جذبے کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ جنگل اور شہر کی فضا میں زیادہ فرق نہیں ہے لیکن کہانی حزن اور ملال کے بجائے امید اور روشنی کی منزل پر اختتام کو پہنچتی ہے۔

جدیدیت کے نام پر تجریدی کہانیوں کا ایک جنگل اگا تھا اور ہمارے بیشتر افسانہ نگار بھی اس کا شکار ہوئے تھے لیکن ظفر اوگانوی نے اپنی کہانیوں کو تجرید کے حبس زدہ موسم سے بچائے رکھا اگر چہ ان کہانیوں میں تمام کہانیاں ظفر اوگانوی کی شناخت نہیں بنی ہیں اور نہ ہی داخلی انتشار اور نفسیاتی عوامل کی پیشکش میں بے داغ ہیں تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کہانیاں کسی ''ڈائلیما کا شکار'' نہیں۔ یہ موضوع، مواد، مسائل کے گہرے شعور سے متصف کہانیاں ہیں۔ ان کی آخری دور کی کہانیوں میں روایت، علامت اور تجربہ پسندی کا خوبصورت انضمام نظر آتا ہے۔ ان کہانیوں کی ایک اور اہم جہت ان کی مقامیت، علاقائیت میں پوشیدہ ہے۔ مثال کے طور پر ان کی پرانی کہانیوں میں ''اپنا رنگ'' اور بعد کی کہانیوں میں ''قصہ ایک مجسمے کا'' (یہاں بھی مجسمے کی شناخت کا مسئلہ درپیش ہے) سے لے کر ''نکلا جو حرف دعا'' تک مقامی اقدار کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کہانیوں کے تعین قدر کے سلسلے میں مقامیت کی یہ جہت اہمیت رکھتی ہے اور معنی کی کثرت کا احساس ہوتا ہے۔ شہر کلکتہ اور اس کی تہذیبی زندگی کا واضح تصور ابھرتا ہے۔ اس شہر کے مقامی اقدار اور ثقافتی مظاہر دیگر شہروں کے مقابلے میں منفرد اور مختلف ہیں۔ ہمارے بعض ناقدین جو مابعد جدید افسانوں کی خصوصیات میں دلچسپی رکھتے ہیں مقامیت اور ان کی کہانی ''شگاف'' میں Voyerism کے حوالے سے Pornography کے تحت، ان کی کہانیوں کی مابعد جدید تفسیر وتعبیر کر سکتے ہیں۔ عام قاری کے لئے تو یہ جدیدیت کی توسیع کی صورت میں ہی معنی خیزی کا وسیلہ بن سکتی ہے۔ مزید یہ کہ مقامی اقدار، آہنگ اور تخلیقی زبان کے ارتباط واتصال سے معنی کی کیفیت اور اس کی اثر انگیزی میں اضافہ ہوا ہے اور افسانہ نگار کا بیانیہ اسلوب قصہ گوئی کے فن سے گہرے طور پر مربوط ومشروط ہو گیا ہے۔

○○

کلام حیدری: شخصیت اور فن

معصوم عزیز کاظمی

(گزشتہ سے پیوستہ)

''تحی'' کا شمار کلام حیدری کے کامیاب ترین افسانوں میں ہوتا ہے۔ یہ افسانہ الہ آباد یونیورسیٹی، لکھنو یونیورسیٹی اور گورکھپور یونیورسیٹی کے درسی نصاب میں شامل رہا۔ یہ افسانہ ۱۹۴۷ء کے آس پاس کے ہندوستان کے ایک صنعتی شہر کلکتہ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کلام حیدری نے اپنے جدوجہد کے دور میں کلکتہ کو جیسا پایا اس کی منظر کشی اس افسانے میں کی گئی ہے۔ افسانہ کا راوی واحد متکلم ہے۔ واقعات اور حالات کے اظہار کے لئے بیانیہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ پوری کہانی انسانی ضمیر اور معاشی ضروریات کی کشمکش کی خوبصورت پیشکش ہے۔ جبلت انسانی اور معاشی مجبوریاں انسان کو کن مقامات سے گزرنے کے لئے مجبور کرتی ہیں یہ کہانی اس کی آئینہ دار ہے۔ شرافت، نیکی اور پاکیزگی انسان کے بنیادی اوصاف ہیں اور اس کے خمیر میں شامل ہیں۔ یہ اوصاف حمیدہ حالات کا شکار ہو کر کمزور اور پامال ہوتے ہیں لیکن یکسر مردہ نہیں ہوتے۔ کوئی واقعہ، کوئی حادثہ کوئی دستک اسے بیدار کرنے کیلئے کافی ہے۔ کلام حیدری نے بھی اس افسانے میں اسی حقیقت کو اجاگر کیا ہے۔

اس کہانی کا مرکزی کردار بیکار اور بدحال ہے۔ وہ اپنی ضروریات اور آنے والے کل کے لئے متفکر ہے اور بے چارگی کے تانڈو کا شکار ہے۔ للچائی نظروں سے سب کچھ دیکھتا ہے لیکن بے بس ہے۔ مجبور ہو کر ایک دن وہ اپنے ضمیر کو پس پشت ڈال کر مولا بخش سے جھوٹ بول کر ساٹھ روپے حاصل کر لیتا ہے۔ مولا بخش کی بیوی کو منی آرڈر نہ بھیج کر وہ اپنی دبی ہوئی خواہش کی

تکمیل کے لئے اس رقم کا کچھ حصہ اپنی ذات پر صرف کرنے میں بھی کوئی ہچک محسوس نہیں کرتا ہے۔ اسے مولا بخش کی بیوی کا خیال آتا ہے لیکن وہ اس کے خیال کو اپنے ذہن سے نکال کر دور پھینک دیتا ہے، لیکن جب وہ سڑک پر مولا بخش کی لاش دیکھتا ہے تو اس کا ضمیر یک لخت بیدار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ضروریات اور مجبوریوں کو فراموش کر کے جیب میں باقی رقم کو مولا بخش کے کفن دفن کے لئے لاش پہ پھینک دیتا ہے۔ ضمیر کی یہ بیداری انسان اور انسانیت کی فتح — کلام حیدری کا سادہ اور رواں دواں اسلوب کہانی کی جان ہے۔ مرکزی کردار کے ذہن میں واقعات کی یورش کہانی کو دو آتشہ بناتی ہے۔

''نخی'' کا مطالعہ پریم چند کے افسانہ ''کفن'' کی یاد تازہ کرتا ہے۔ دونوں افسانوں میں مماثلت کی تلاش بھی کی گئی ہے لیکن میرے خیال میں ان میں تضاد زیادہ ہے۔ ''نخی'' کا مرکزی کردار شہری علاقے کا تعلیم یافتہ ہے جبکہ ''کفن'' کا مرکزی کردار دیہی علاقے کا مزدور ہے۔ ایک معاش کی تلاش میں سرگرداں ہے اور دوسرا کام چور ہے۔ ایک بے بس ہے اور دوسرا خود غرض۔ کسی کی موت دیکھ کر ایک کا ضمیر بیدار ہوتا ہے اور دوسرا اپنے ضمیر کو تھپکیاں دے کر سلا دیتا ہے۔ ایک اپنے عمل پہ نادم اور دوسرا اپنے خجر یزدہ عمل کو دہرانے کے لئے تیار ہے۔ ایک جذبہ ترحم سے متاثر ہو کر نیک عمل کی ترغیب پاتا ہے اور دوسرا جذبہ ترحم سے ناشناس ہمدردی میں ملے پیسے سے شراب نوشی کا منصوبہ بناتا ہے۔ دونوں افسانوں کا مرکزی کردار ایک عام آدمی ہے اور اس کی نفسیات اور مسائل کی عکاسی میں پریم چند اور کلام حیدری کامیاب رہے ہیں۔

''صفر'' کلام حیدری کے افسانوں کے دوسرے مجموعے کا آخری افسانہ ہے۔ یہ افسانہ اس دور کی تخلیق ہے جب جدیدیت کا جادو ہر کسی کے سر پر سوار تھا۔ افسانہ نگار نہ صرف Formless,plotless بلکہ Senseless کہانیاں لکھ رہے تھے استعارہ اور علامت سلامت تھے لیکن ان کو برتنے کے جوش میں کہانی گم ہو گئی تھی۔ ابہام کے دھند میں قاری گم ہو گیا تھا۔ جدیدیت کا غلبہ اتنا شدید تھا کہ ہر افسانہ نگار بہ زور قلم کہہ رہا تھا:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کلام حیدری بھی جدیدیت کے اس رجحان کی زد میں آ گئے۔ خود ان کے الفاظ میں:—

''فنکار سے کوئی ان کے جدید بننے کے حق کو نہیں چھین سکتا ہے۔ فنکار اپنے ماضی سے اس طور پر مطمئن نہیں ہو سکتا کہ وہ اس سے آگے جانے کی

ضرورت ہی نہ محسوس کر سکے۔"

"صفر" ایک ایسا افسانہ ہے جو عام قاری کیا سنجیدہ قاری کی سمجھ سے باہر ہے۔ اس افسانہ کو سمجھنے کے لئے شاید پہلے ایک تجزیہ یا تبصرہ کا مطالعہ ضروری ہے۔ ترقی کی معراج تک پہنچنا انسان کی فطری خواہش ہے۔ ساری زندگی اس کی بلند سے بلند تر کی جستجو اور تلاش جاری رہتی ہے۔ یہ تلاش، یہ جستجو، یہ حصول ایک فریب پیہم ہے جو اسے سکون اور اطمینان عطا نہیں کرتا ہے۔ انجام کار وہ مایوسی کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے۔ زندگی کی اس حقیقت کو کلام حیدری نے استعاراتی انداز میں پیش کیا ہے لیکن وہ اس عمل میں ترسیل کی ناکامی کا شکار ہو گئے ہیں۔ افسانے میں نقطہ، سیڑھی، ڈنڈا، جھولا وغیرہ علامت کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں لیکن یہ غیر واضح اور مبہم ہیں۔ قاری کے ذہن کو یہ کوئی سمت عطا نہیں کرتے ہیں۔ کلام حیدری کو قصہ گوئی کا فن آتا ہے لیکن اس افسانے میں وہ تکلفات کا شکار ہیں اور ایک کوشش کے عمل سے گذرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کوشش میں ان کا ذہن اور قلم ہم آہنگ نہیں ہو سکا ہے اور وہ ناکامی کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ افسانہ ان کے ادبی سفر کا میل کا پتھر یا پڑاؤ نہیں بن سکا ہے۔

کلام حیدری کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ "الف لام میم" ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں "الف لام میم" کے عنوان سے شامل افسانہ پینتالس صفحات پر محیط ہے۔ اس کا عنوان معنی خیز اور حیرت انگیز ہے۔ کتاب الٰہی میں بطور الفاظ استعمال کے گئے یہ مقطعات کے حروف کا استعمال افسانہ کے عنوان کے لئے عجیب وغروب تاثر دیتا ہے۔ سورۃ بقرہ میں ان حروف کو یکجا کر کے اللہ نے نازل کیا ہے لیکن اس کے اسرار و رموز کو مخفی رکھا ہے۔ افسانہ نگار نے ان حروف کو افسانے کا عنوان کیوں بنایا یہ ایک معمہ ہے جو افسانے کے مطالعے کے بعد بھی حل نہیں ہوتا ہے۔ کلام حیدری تشکیک کا شکار اور مذہب بیزار تھے۔ وہ فہم و دانش کے قائل تھے۔ اس نظریے کا اظہار افسانے میں ان الفاظ میں ہوا ہے:

> "کیونکہ زبان تو چودہ سو سال پرانے الفاظ کا بھی مطلب نکال سکتی ہے، زبان تو الفاظ بنائے بغیر حرف کو معنی سمجھ کر ادا کر سکتی ہے۔ بغیر یہ پرواہ کئے کہ حرف کے معنی تم آج سمجھو گے یا چودہ سو سال بعد۔ یا آج سمجھو یا چودہ سال بعد بھول جاؤ گے اور اپنے جذبہ احترام کو فہم کا بدل سمجھ کر قناعت کر لو گے۔
>
> بتاؤ الف کے معنی!

بتاؤ لام کے معنی!
بتاؤ میم کے معنی!
احترام پر قناعت کرنے والو۔فہم کو کہاں چھوڑ آئے۔؟ عقیدت اور دانش
کو ایک سمجھ کر تم کس خانے میں رکھے جاؤ گے۔؟"

کلام حیدری خود اس افسانے کو اپنا ایک کامیاب افسانہ گردانتے ہیں۔ان کے الفاظ میں:-

"ہندوستان اور پاکستان کی سرحدوں کو پار کر جانے والا یہ افسانہ درجنوں
تبصروں سے سجایا گیا ہے۔"

اس افسانے میں افسانہ نگار خود کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ماضی بعید اور ماضی قریب کی یادیں اس کے ذہن کے دھند سے نکل ایک دوسرے سے صف آرا ہوتی ہیں۔خود کلامی اسے زندگی کی تلخ و شیریں نشیب و فراز سے روبرو کراتی ہیں۔ یاد ماضی کو اس افسانے میں مرکزیت حاصل ہے۔شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال ماضی کے احساسات اور تجربات کو ایک سلسلے میں پرو دیتا ہے اور اسے منتشر ہونے سے بچالیتا ہے۔ بشری کمزوری، خود غرضی، بے بسی اور مجبوری زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر انسان کو احساس دلاتی ہے کہ جن کامیابیوں کا نشہ و سرور اس پر سوار تھا دراصل وہ اس کی ناکامیوں کی پرفریب داستان تھی۔ کہانی کی ابتدا میں ایک ایسا منظر پیش کیا گیا ہے جو کہانی کا محرک ہے۔مندرجہ ذیل اقتباس سے اس کی تائید ہوتی ہے:-

"دوستو تم مت آؤ کیونکہ میرے اور تمہارے درمیان ماہ و سال کے بیشمار
پردے پڑے ہیں۔ کیونکہ تمہارے اور میرے درمیان یادوں کی خوشبوؤں
کی کئی پرتیں ہیں کیونکہ میرے اور تمہارے درمیان خلوص اور بدگمانیوں کی
تاریخوں کے ملبے پڑے ہیں۔"

افسانے میں کئی مقامات ایسے آتے ہیں جہاں کلام حیدری خود موجود ہیں اور آپ بیتی (اپنی زندگی کے کچھ سچ) کو ٹکڑوں میں سنا رہے ہیں۔ کہانی کے مختلف مقامات میں استعمال کئے گئے الفاظ اور جملے اس کی تائید کرتے ہیں — کنکریٹ کے Prestressed سلیپرس، کالے گاؤن گلابی اسکارف، سارا شہر میرے دھونس کا شکار ہے۔ سب جلوس کی شکل اختیار کر گئے، میرے دونوں ہاتھوں میں لوہے کی چوڑیاں، مولوی اللہ بخش، پیاری بہن، لکچراری تو میں نے چھ سال کی، اردو پروفیسروں کی بڑھتی تعداد سے اردو زندہ نہیں رہے گی، جمہوریت کے سورج

کی پہلی کرن کوموٹی دیواروں کے پار دیکھا تھا،لکھ پتیوں کے بازار میں مجھے لیکھک سمجھا جاتا ہے — اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ کلام حیدری نے خود بینی وخود احتسابی کے بعد ہی ان الفاظ اور جملوں کو کہانی میں استعمال کیا ہے۔ان کے ذاتی تجربات میں تنوع اور گہرائی ہے۔ ذاتی تجربات کے پردے میں انہوں نے عصری حادثات اور تضادات کو پیش کیا ہے۔اس کہانی کا کردار، قادری، خود کلام حیدری ہیں جو صنعتی دور کی کمینگی، کرب اور اذیت کا بوجھ اپنے ضمیر پر ڈھورہے ہیں اور بے بس ہیں۔ افسانے کی طوالت قاری کو گراں گذرتی ہے لیکن مرصع سازی سے پاک رواں دواں اسلوب قاری کے ذہن کو متاثر کرتی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کو اس بات کا اعتراف ہے کہ کلام حیدری کو افسانے میں شدت و شتابی کا فن ابھارنا آتا ہے لیکن وہ "الف لام میم" کو ایک بکھرا بکھرا افسانہ قرار دیتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی اسی رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے کیونکہ اس افسانہ کے مختلف منازل میں ربط، تسلسل اور تنظیم ہے۔ فاروقی معترف ہیں کہ اس افسانے کا ہر صفحہ فلم کے منظر کی طرح متحرک ہے اور زندہ وجود کا تاثر دیتا ہے۔ پورے افسانے میں حرکت ورفتار کے پیکر قاری پر دباؤ ڈالتے ہیں اور وہ افسانے کو پڑھتا چلا جاتا ہے۔اس افسانے کا کینوس وسیع ہے اور زمان ومکان کی قید سے آزاد ہے۔ یہ افسانہ کلام حیدری کی بحیثیت افسانہ نگار ایک پہچان ہے۔

"گولڈن جوبلی" کلام حیدری کے افسانوں کا آخری مجموعہ ہے۔ یہ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔اس مجموعے میں کل انسانوں کی تعداد چودہ ہے۔ پہلا افسانہ "گولڈن جوبلی" جدیدیت کے رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے اس میں زندگی کی بے معنویت اور بے مقصدیت کو پیش کرنے میں فلسفیانہ انداز اختیار کیا ہے جو آمد نہیں آورد کا پتہ دیتا ہے۔ پورا افسانہ ذہنی خلفشار اور بے وقعتی کا بیان ہے لیکن نامکمل اور تشنہ۔ کلام حیدری جدیدیت کے قائل رہے لیکن ادھوری جدیدیت۔ یہ صداقت ان کے فن سے برابر خراج وصول کرتی رہی۔ یہ کہانی بھی جدیدیت سے آدھی ادھوری وابستگی کا شکار ہوگئی ہے۔اس میں تخلیقی بے ساختگی معدوم ہے۔کہانی کے دو کردار پرشوتم اور "میں" زندگی کے پچاس سالہ حصول کو مکالماتی انداز میں آگے بڑھاتے ہیں۔ افسانہ نگار نے ایک مکالمے کے بطن سے دوسرا مکالمہ سوالیہ انداز میں تخلیق کیا ہے۔لیکن اس عمل میں فنی حسن کا فقدان ہے،مادیت پرست سماج اور غرض مندانہ ماحول میں سب کچھ پا کر بے حصولی کے احساس پہ کہانی مرکوز ہے۔ مرکزی کردار میں اپنے بے حقیقت ہونے کا احساس فروغ پاتا ہے اور وہ ذہنی خلفشار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔آس پاس کی رنگینیاں اور سرگرمیاں اس کی روح کی

شکست کی منادی کرتی ہیں۔ اس کہانی میں نظم وضبط کا فقدان ہے اس لئے بعد از مطالعہ حصول صفر ہے۔ تجریدی اور تمثیلی انداز افسانے کے مرکزی خیال کو نقطۂ انجماد تک پہنچانے میں قاصر ہے۔ کہانی کا عنوان ''گولڈن جوبلی'' علامتی ہے لیکن افسانہ نگار ابہام سے پر پلاٹ لس کہانی تحریر کرنے میں ناکام رہا ہے۔ کلام حیدری کو وقت کی شدید آگہی تھی یا آگہی داخلی کرب کو جنم دیتی ہے، لیکن یہ داخلی کرب مناسب و مطلوبہ الفاظ کا جامہ نہیں پہن سکا ہے۔ تصنع سے پُر اسلوب، الفاظ کی بیجا تکرار، ذہنی انتشار کو قاری کی قبولیت دلانے میں قاصر رہے ہیں۔

کلام حیدری کا پہلا افسانہ ''بھابھی'' ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا اور آخری افسانہ ''پورب کی جیوتی'' ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔ اس طرح افسانوی ادب میں وہ قریب چوالس (۴۴) سال سرگرم رہے اور انہوں نے مختلف پڑاو پر قیام کیا۔ ترقی پسندی سے جدیدیت تک کا ان کا سفر ہنگامہ خیز رہا۔ سماج و ادب میں رونما تغیرات سے ان کا قلم اچھوتا نہیں رہا۔ اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی شکست نے سماج میں نئی صداقتوں کو جنم دیا اور نئے تجربات کو فروغ ملا۔ فرد کی گم شدگی، بے چہرگی عام ہوئی جس کے زیر اثر علامتی، استعاراتی اور تمثیلی پیرائے میں کہانیاں لکھی گئیں۔ کلام حیدری نے بھی مختلف پیرائے میں کہانیاں لکھیں لیکن تقلید کے قائل نہ رہے، جس کا اعتراف انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:-

> ''میں نے شروع ہی سے ایک الگ راہ بنائی ہے۔ وہ چاہے پگڈنڈی کیوں نہ ہو۔ میں شاہراہ بنانے کی اہلیت رکھتا ہوں کہ نہیں یہ فیصلہ کرنا مستقبل اور دوسروں کا کام ہے۔ میں اپنے انداز نظر اور طریقۂ فکر کو تجسس اور تشکیک آمیز پاتا ہوں۔ تقلید کرنے اور مرعوب ہونے کو ہمیشہ کفر جانا۔''

کلام حیدری کی قصہ گوئی کا اپنا ایک انداز ہے جو بھیڑ میں بھی اپنی شناخت رکھتی ہے۔ ان کہانیوں میں بے بسی، بے چارگی، ناانصافی، جبر، استحصال، خودغرضی، داخلی کرب، خارجی کھوکھلا پن اور تشکیک کے احساسات الفاظ کے پیراہن میں اترتے رہے ہیں۔ انہوں نے پریم چند کے بیانیہ حقیقت پرستی کو کرشن چندر کی رومانی حقیقت پرستی پر ترجیح دی ہے۔ ان کی نثر میں سادگی، بے ساختگی اور معنویت نمایاں ہے۔ اپنے ابتدائی دور میں کلام حیدری نے ''قمر'' کے تخلص کے ساتھ شاعری بھی کی تھی لیکن نثر نگاری میں شاعری ان کے لئے شجرِ ممنوعہ تھی۔ ان کے خیال میں افسانہ نگاری شاعری کے مقابلے میں زیادہ مشکل کام ہے۔ ان کی افسانوی زندگی کا ایک آدرش تھا جو ان کی سیاسی، سماجی اور معاشی تصور سے ابھرا تھا۔ شیخ ایاز کا قول ہے کہ انسان کی

محبت، نفرت، حرص، ہوس، ترقی، تنزلی ایک ادیب کو تصورات کی ایک عجیب وغریب دنیا میں لے جاتی ہے۔ کلام حیدری نے بحیثیت ادیب اس عجیب وغریب دنیا کی خوب سیر کی ہے۔ کلام حیدری مقبول افسانہ نگار تھے لیکن محبوب نہیں۔ اپنے ادبی سفر میں انہوں نے مختلف مشاہیر ادب سے محبت کی لیکن کسی کو عقیدت کے مقام پہ فائز نہ کر سکے۔ تمام عمر وہ ایک بت تراشتے اور ایک بت گراتے رہے۔ ان کا اپنا اعتماد، عہد، مطالعہ اور مشاہدہ ان سے معیاری کہانیاں لکھواتا رہا۔ وہ اپنے دور کے فعال اور حساس فنکار رہے۔ ان کی اہمیت مسلم ہے۔ اردو افسانہ انہیں نظر انداز کر کے مکمل ہونے کا دعوی نہیں کر سکتا۔

○○

عظیم ناول '' آگ کا دریا'' دو مزید غلط فہمیاں

عبداللہ جاوید

سہ ماہی ''مونتاج''، لاہور، شمارہ ۶، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء ص ۴۲ تا ۵۱ میں '' آگ کا دریا'' اور قرۃ العین حیدر کے بارے میں چند غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس ضمن میں عام غلط فہمیوں کو چھ گروہوں میں تقسیم کیا تھا:

(۱) ترقی پسندانہ تنقید	(۲) پاکستانی قوم پرستانہ تنقید
(۳) محکمہ جاتی سیاست کا شاخسانہ	(۴) مذہب کی اساس پر تنقید
(۵) لسانی بنیاد پر تنقید	(۶) متفرق اعتراضات

متذکرہ مضمون کی اشاعت کے بعد کسی بھی جانب سے کوئی سن گن نہیں ملی۔ حال ہی میں دو معاملات سامنے آئے ہیں۔ ان کو بھی میں غلط فہمیوں میں شمار کرنا مناسب خیال کرتا ہوں۔ پہلی غلط فہمی ناول '' آگ کا دریا'' کے متن اور ایک کردار سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری فکری اور نظریاتی ہے۔

'' آگ کا دریا'' مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ص ۹۹:-

> ''سرجو کی موجیں گوتم نیلمبر کے اوپر سے گزرتی چلی گئیں۔ ابوالمنصور کمال الدین نے کنارے پر پہنچ کر اپنا شیام کرن گھوڑا برگد کے درخت کے نیچے باندھا اور چاروں اور نظر ڈالی۔''

اوپر دیا ہوا حوالہ ایک کردار ابوالمنصور کمال الدین ناول میں: ولین: داخلے (First entry)

سے تعلق رکھتا ہے۔ اعتراض یا غلط فہمی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کچھ یوں ہے:-

"ابوالمنصور کمال الدین جس طرح داخل ہوا اسی طرح ہندوستان سے نکل گیا۔"

وہ جونپور کے سلطان حسین شرقی کے کتب خانے کا نگراں تھا۔ سلطان حسین شرقی جو اندر سے ایک موسیقی نواز، سرسنگیت کی ایک دو نئی جہتوں کا خالق اور علم دوست تھا، لیکن جس کے باہر پر وقت نے افغانوں سے ہمہ وقتی یلغار، جنگ اور سازشوں کو مسلط کر دیا تھا۔ ایسے سلطان کے تحت نگرانِ کتب خانہ کے فرائض انجام دینے والا ابوالمنصور کمال الدین بھی اپنے سلطان کی مانند مجموعۂ اضداد ہوگا۔ وہ آئے دن ہونے والی چھوٹی بڑی جنگوں میں شمشیر زنی کرتا اور درمیانی وقفوں میں نایاب کتابوں اور قدیمی تانب پتروں کے حصول میں سرگرداں پھرتا اور دو حسیناؤں کا سودا بھی لئے رہتا۔ ایک سیدزادی، دوسری برہمن زادی۔ سلطان حسین شرقی کی داستان ہو یا ابوالمنصور کمال الدین کا قصہ دونوں کہنے، سننے، لکھنے، پڑھنے کے لائق ہیں۔ لیکن اس وقت ان دونوں داستانوں کو بالائے طاق رکھ کر آپ کی خدمت میں صرف اس حقیقت کو پیش کرنا ہے کہ ابوالمنصور کمال الدین جس طرح ہندوستان آیا اسی طرح نکل گیا یا اس مٹی کا ہو گیا۔ اس ضمن میں پہلے یہ حوالہ ملاحظہ کریں:-

"وہ (ابوالمنصور کمال الدین) مہینوں یونہی ادھر ادھر پھرا کیا۔ ایک بار وہ ایودھیا سے کئی مہینے تک واپس نہ آیا۔ کاشی میں اس کی ڈھنڈیا مچی۔ لاابالی سیلانی آدمی ہے۔ بغداد لوٹ گیا ہوگا۔ کسی نے کہا مگر اسے بغداد سے کیا مطلب؟...... میاں کبیرا سے دیکھ کر مسکرا دئے۔ تال سوکھ کر پتھر بھیو، ہنس کہیں نہ جائے۔ پچھلی پیت کے کارنے کنکر چن چن کھائے۔ انہوں نے کچھ دیر سوچ میں ڈوبنے کے بعد کپڑے کا تانا تیار کرتے ہوئے کہا۔"

(آگ کا دریا، ص ۱۳۸)

اس حوالے پر بھی توجہ دیجئے:-

"کمال حیرت زدہ بیٹھا یہ عجیب و غریب نعت سنتا رہا اور پھر گانے والوں کی آواز میں آواز ملا کر خود بھی گانے میں شامل ہو گیا۔ اب وہ بغداد سے ہزاروں لاکھوں میل دور نکل آیا تھا۔ مذہب اپنے گردوپیش، اپنے ماحول اور پس منظر سے کس طرح متاثر ہوتا ہے۔ کس طرح اس کی جڑیں ایک اجنبی

سرزمین میں پھیلتی ہیں۔ کمال گا تا رہا گا تا رہا۔ جے ہو، جے ہو، جے ہو۔
اب وہ ایک نئی زبان سیکھ رہا تھا۔ یہ بنگالی زبان تھی۔ یہ بڑی میٹھی زبان
تھی۔ اب وہ اسے اپنی زبان سمجھنے لگا، اسی میں بات چیت کرتا، اسی میں
سوچتا، اسی میں لکھتا۔" (آگ کا دریا۔ص ۱۴۰، ۱۴۱)

اس حوالے پر ایک نظر ڈالئے:۔

"کئی سال تک وہ اسی طرح کہانیاں اور گیت لکھتا رہا، وہ مورخ، محقق،
سیاستداں، سپاہی، صوفی، کبیر کا چیلا۔ اب گیت کار بن چکا تھا...... اسی
طرح گھومتے پھرتے وہ سونار گاؤں پہنچا اور وہاں اس نے شادی کر لی۔
اس لڑکی کا نام شنیلا تھا، وہ ذات کی شودر تھی" (آگ کا دریا، ص ۱۴۳)

اس اقتباس پر توجہ دیجئے:۔

"اس کی بی بی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس نے آمنہ (شنیلا) کو اپنے ہاتھوں
سے اسی تالاب کے کنارے دفن کیا تھا۔ اب اسکے بال سفید ہو چکے تھے۔
اب بھی وہ دن بھر برآمدے میں بیٹھا مرشدی اور معرفتی نغمے لکھتا اور گاتا،
اس کے بیٹے گوڑ سے آتے اور اسے ملک کی سیاست کی خبریں سناتے،
لیکن یہ خبریں اب اسے بالکل کسی دوسرے سیارے کی باتیں معلوم ہوتیں
کیونکہ بغداد کا ابوالمنصور کمال الدین بنگالے کا باشندہ تھا۔ بنگالی تھا۔"

(آگ کا دریا، ص ۱۴۲)

اس ضمن میں یہ اقتباس بھی پڑھ لیتے ہیں:۔

"اسے پٹھانوں اور مغلوں کے جھگڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں، وہ صرف
اتنا چاہتا ہے کہ یہاں اسے امن سے رہنے دیا جائے۔ یہ اس کا ملک ہے
اس کا وطن! یہاں اس کے بچے پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں اس کی بی بی کی
قبر ہے، یہاں اس کے دھان کے ہرے کھیت ہیں، اس نے اس زبان کی
آبیاری کی ہے۔ اس نے گیت بنائے ہیں، وہ یہیں رہے گا۔ اسے غدار
کہنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ یہ دارالحرب اور دارالسلام ہے۔ اس لمحے
اسے انکشاف ہوا دارالحرب اور دارالسلام میں کوئی فرق نہیں، صرف
روپے کا فرق ہے۔ لڑائیاں دو مذہبوں کے درمیان نہیں ہوتیں دو سیاسی

طاقتوں کے درمیان ہوتی ہیں۔

سہسرام کا شیر خاں اور دلی کا ہمایوں بادشاہ دونوں کلمہ گو ہیں لیکن ایک نے آ کر دوسرے کا قلع قمع کر دیا۔ دار السلام بھی دار الحرب بن سکتا ہے، اگر اس میں شر کا وجود ہو۔

شیر خاں کی فوج کے اجڈ سپاہی یہ سب کہاں سمجھ سکتے تھے۔ انہوں نے زور سے کمال کو دھکا دے کر گرایا اور ہلڑ مچاتے آگے بڑھ گئے۔

کمال اپنے گھر کی دہلیز پر اوندھے منہ گرا، اس کے منہ سے خون کی ندی بہہ گئی اور چند گھنٹے تک سسکتے رہنے کے بعد وہ اسی طرح پڑا پڑا خاموشی سے ختم ہو گیا۔" (آگ کا دریا، ص ۱۴۴)

آپ نے مندرجہ بالا اقتباس کی بنیاد پر اپنے طور پر یہ نتیجہ نکال لیا ہوگا کہ ابو المنصور کمال الدین جس طرح ہندوستان آیا اسی طرح ہندوستان سے نکل نہیں گیا بلکہ یہیں رس بس گیا۔ بنگالی بن کر مرا۔ بنگالی زبان نہ صرف سیکھی بلکہ اس کو پروان چڑھانے میں حصہ لیا۔ اس زبان میں گیت لکھے اور گائے۔ وہ ہندوستان سے نہیں بلکہ بغداد سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل گیا۔

اب اگر کوئی اس کمال کی بات کرے تو تقسیم ہند کے بعد ہندوستان یا برصغیر کے اس علاقے میں ہجرت کر گیا جو تبدیل شدہ جغرافیے کے تحت نوزائیدہ ملک پاکستان کہلایا تو وہ کہیں سے ہمارا موضوع بحث قرار نہیں پاتا۔ وہ بغداد سے ہندوستان آنے والا ابو المنصور کمال الدین ہی نہیں کہلایا جا سکتا۔ میں نے بحث و تمحیص کا راستہ اپنانے کی بجائے ناول کے اقتباسات سے کام لیا ہے۔ توقع ہے بیشتر پڑھنے والوں کو یہ انداز پسند آئے گا۔ آخر میں ایک اقتباس پڑھنے کی درخواست کروں گا جس کو سب سے پہلے پڑھنا اور پڑھوانا تھا:۔

"یار گوتم"

"ہاں"

"یار کمال ہمیں دغا دے گیا۔" ہری شنکر نے چند لمحوں بعد آہستہ سے کہا۔۔۔۔۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ سیڑھیاں اتر کر وہ ندی کے کنارے آئے اور پانی کو دیکھتے رہے۔ شاید وہ دونوں اکٹھے سوچ رہے تھے کہ ابو المنصور کمال الدین کس طرح ہندوستان میں داخل ہوا تھا اور کس طرح ہندوستان سے نکل گیا۔"

آپ کو اس اقتباس نے بتا دیا ہوگا کہ دو دوستوں کا جذباتی، وقتی اور غیر حقیقی ردعمل ہے جس کو گمراہ کن غلط فہمی کی بنیاد بنالیا گیا۔

اب میں آپ کو اس غلط فہمی کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں جس کا تعلق پروفیسر فتح محمد ملک کے مضمون "قرۃ العین، اپنی تلاش میں" مطبوعہ "روشنائی"، کراچی، شمارہ ۲۴ (قرۃ العین حیدر نمبر) ص ۲۲۷ تا ۲۳۶ سے ہے۔

متذکرہ مضمون کے آغاز ہی میں پروفیسر فتح محمد ملک فرماتے ہیں:-

> "قرۃ العین حیدر کے ہاں تلاش ذات کے سفر کے موجودہ مرحلے کا خیال کرتا ہوں تو اقبال یاد آتے ہیں۔ اس تلازم خیال پر غور کرتا ہوں تو اقبال اور قرۃ العین کے کارنامۂ فن میں چند در چند مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ اقبال ہی کے مانند قرۃ العین بھی آتش رفتہ کے سراغ میں ہیں اور ان کی تمام سرگزشت بھی کھوئے ہوؤں کی جستجو سے عبارت ہے۔ اقبال نے ہماری شاعری کو فلسفیانہ رنگ و آہنگ بخشا تو قرۃ العین نے ہمارے فکشن کو گہرے فلسفیانہ انداز میں سوچنا سکھایا۔ دونوں کی تخلیقی بے چینی کا سرچشمہ ایک ہے۔ دونوں کا سوز و سازِ آرزومندی مسلمانوں کے اجتماعی مقدر پر غور و فکر سے پھوٹا ہے اور دونوں کے ہاں یہ موضوع بالاخر وقت اور تاریخ کی ماہیت و معنویت پر فکری و تہذیبی مراقبہ بن گیا ہے۔ پھر ہر دو متفکر فنکار ہم نصیب بھی ہیں۔ اقبال عمر بھر جس فکری تنہائی اور روحانی اضطراب سے دوچار رہے، فکری اجنبیت اور روحانی جلاوطنی کا وہی احساس قرۃ العین حیدر کا مقدر ہے۔"

میرا خیال ہے کہ پروفیسر فتح محمد ملک نے اقبال اور قرۃ العین حیدر کے مابین جس انداز میں چند در چند مماثلتیں تلاش کی ہیں اس انداز میں دنیائے شعر و ادب کے کئی اور تخلیق کاروں میں اسی نہج کی مماثلتیں موجود مل جائیں گی تو کیا ہم ان سب کو قرۃ العین کی طرح اقبال کے حلقۂ ارادت میں داخل کردیں گے؟ دنیا کے چند عظیم فنکار 'آتش رفتہ کے سراغ' میں اور 'کھوئے ہوؤں کی جستجو' میں مصروف دیکھے گئے، اسی طرح فلسفیانہ رنگ و آہنگ کی شاعری اور فکشن کے تخلیق کار بھی خاصی تعداد میں گزرے ہیں۔ ان سب کو بھی اقبال اور قرۃ العین سے ہم رشتہ کرلیا جائے گا۔ ایسا کیا جائے بھی تو کیا حاصل ہوگا۔ شعر و ادب کا معاملہ اتنا نازک ہے کہ کولرج اور

ورڈس ورتھ رومانٹک شعرا کے گروہ میں شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے قطبین کا فاصلہ رکھتے ہیں۔ دانتے، ملٹن اور اقبال ایک دوسرے سے میلوں دور ہیں۔ کیا والٹ وٹ مین کو اس کی نظم "سانگ آف مائی سلف" کی اساس پر اقبال سے جوڑا جا سکتا ہے۔ یہ جو پروفیسر فتح محمد ملک نے لکھا ہے: "دونوں (اقبال اور قرۃ العین حیدر) کی تخلیقی بے چینی کا سرچشمہ ایک ہے۔" کس طرح قابل قبول ہو سکتا ہے۔ اقبال کی 'تخلیقی بے چینی' کا سرچشمہ تو گھیر گھار کر ایک کیا جا سکتا ہے لیکن قرۃ العین حیدر کی تخلیقی بے چینی کے چشمے کسی بھی جتن سے ایک نہیں کیے جا سکتے۔ رہی یہ بات کہ ان دونوں کے چشمے ایک ہو جائیں تو یہی کہا جا سکتا ہے "ایں خیال است و محال است و جنوں" یہاں میرا موضوع قرۃ العین حیدر سے متعلق ہے اور میں اتنی ڈھیل دینے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ قرۃ العین کے متعدد چشموں میں اس چشمہ کو بھی شامل کر لوں لیکن اس سے نقصان اقبال والوں کا ہی ہوگا اور میں خود بھی تو اقبال والا ہوں۔ جہاں تک میں نے سمجھنے کی کوشش کی ہے قرۃ العین اور اقبال کو جوڑنے سے بہتر ہے کہ ان معاملات میں اقبال کو حالی سے جڑا رکھا جائے "دونوں کا سوز و ساز آرزومندی مسلمانوں کے اجتماعی مقدر پر غور و فکر سے پھوٹا ہے اور دونوں کے ہاں یہ موضوع بالآخر وقت اور تاریخ کی ماہیت و معنویت پر فکری و تہذیبی مراقبہ بن گیا ہے۔" پروفیسر فتح محمد ملک کا یہ فقرہ حالی اور اقبال پر صادق آتا ہے اس فرق کے ساتھ کہ حالی نے زیادہ توجہ گریہ و فریاد، شکوے شکایت پر دی اور اقبال نے سوچ و چار پر۔ قرۃ العین حیدر کا تصور تاریخ اور نظریہ زمان و مکان اقبال سے قطعی مختلف ہے۔

جن مفکروں، ادیبوں اور شاعروں سے اقبال کا مماثلتی شائبوں کی اساس پر رشتہ جوڑا گیا ہے ان کو لے کر چلنا ہی دشوار لگتا ہے جن کا نام خود اقبال نے لیا ہے وہ بھی مشکلات میں اضافہ کرتے آئے ہیں۔ اور تو اور مرید ہندی اور پیر رومی کے تحت اقبال نے جو نکات اٹھائے ہیں وہ بھی سنبھالے نہیں سنبھلتے ہیں۔ جرمن خاتون محقق اینی میری شیمل (جس نے چالیس برس رومی پر کام کیا) کے علاوہ مغربی مستشرقین اور مترجمین کے کام پر سرسری نظر ڈالی جائے تو یہ ثابت کرنا ممکن دکھائی نہیں دیتا کہ اقبال اور جلال الدین رومی کے مابین کوئی ٹھوس، اساسی فکری مماثلت پائی جاتی ہے۔ ایسی صورت حالات میں قرۃ العین اور اقبال کو جوڑنے کی کوشش ہماری قرۃ العین فہمی اور اقبال فہمی میں الجھنیں پیدا کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔

○○

راہ مضمون تازہ بند نہیں

صغیر افراہیم

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں ایسے بہت نام ملیں گے جو قصر شعروادب کے مایہ ناز ستون ہیں اور جن پر علیگ برادری ناز کرتی ہے۔ مہتاب حیدر نقوی بھی مادر درسگاہ کے انہیں قابل فخر طلبا میں سے ایک ہیں جنہوں نے یہاں کی ادبی فضا میں تازگی اور حرارت کو برقرار رکھا ہے۔ موصوف سے میری پہلی ملاقات فروری ۱۹۷۶ء میں ہوئی۔ میں کینڈی آڈیوریم سے اٹھ کر باہر آرہا تھا کہ اپنے وطن اناؤ کا ذکر سن کر ٹھہر گیا۔ دیکھا کہ برآمدے میں چند نوجوان بے نیازی کی شان میں کھڑے محو گفتگو ہیں۔ میں اور قریب پہنچ گیا مگر ان کی بات چیت جس میں قہقہے زیادہ تھے، سمجھ میں نہ آسکی لیکن جو شخص اناؤ کے محلّہ قلعہ اور چودھرانے کے تعلق سے بات کررہا تھا اس کا چہرہ نقش ہوگیا۔

قد میانہ، بدن چھریرا، رنگ گیہواں، کشادہ پیشانی، چمکتی آنکھیں، چہرے پر متانت اور سنجیدگی، بعد میں معلوم ہوا کہ جناب کا نام مہتاب حیدر نقوی ہے اور جو لوگ محو گفتگو تھے وہ آشفتہ چنگیزی، صلاح الدین پرویز، فرحت احساس، پرویز جعفری اور شارق ادیب تھے۔

اناؤ سے مہتاب حیدر نقوی کا یہ تعلق تھا کہ انکے بڑے بھائی وہاں رہتے تھے۔ شہنشاہ حیدر نقوی اسٹیشن ماسٹر تھے اور ان سے چھوٹے بادشاہ حیدر نقوی ریلوے میں کنٹرولر تھے۔ بادشاہ بھائی کو میں بچپن سے جانتا تھا اور ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ ان کی شادی اناؤ میں ہوئی تھی۔ رہائش چودھرانے میں تھی۔ کچھ دن محلّہ قلعہ میں بھی رہے تھے جہاں کا میں رہنے والا ہوں۔

مہتاب حیدر نقوی، یکم جولائی ۱۹۵۵ء میں غوری خالصہ ضلع ہردوئی میں پیدا ہوئے۔ پانچ اضلاع (لکھنؤ، اناؤ، شاہجہاں پور، لکھیم پور، سیتاپور) سے گھرا ہوا یہ ضلع اودھ کا مردم خیز خطہ رہا ہے اور شروع سے علم دوستی اور ادب نوازی کا گہوارہ کہلایا۔ والد کا نام سید محمد ابراہیم جنہیں مطالعے کا شوق تھا۔ خصوصاً مذہبی کتابیں یا پھر بزرگ شعرا کا کلام۔ فارسی اچھی جانتے تھے۔ شاعری سے رغبت اور شعرا سے محبت کی وجہ سے وہ صاف ستھرا ادبی ذوق رکھتے تھے بلکہ مستقل شعر سنایا کرتے تھے۔ بقول میر:

یہ لوگ بھی غضب کے ہیں، دل پر یہ اختیار
شب موم کرلیا، سحر آہن بنا لیا

غوری خالصہ، سندیلہ ہردوئی روڈ پر سادات کی ایک چھوٹی سی خوشگوار بستی ہے۔ مہتاب حیدر نقوی نے اسی بستی میں سید محمد ابراہیم کی انگلی پکڑ کر دینی اور دنیاوی علم سیکھا اور ادبی ذوق کو ورثے میں قبول کیا۔ انٹر میڈیٹ تک کی تعلیم گاؤں غوث گنج، تحصیل سندیلہ سے حاصل کی اور ۱۹۷۴ء میں علی گڑھ آگئے۔ ابتداً ان کا قیام طبیہ کالج کے ڈاکٹر فخر الدین صاحب کے گھر رہا، پھر امیر منزل کے کمرہ نمبر ۱۲ میں منتقل ہوگئے۔ ۱۹۷۵ء میں بی اے (آنرز) اردو میں داخلہ لیا۔ دوسرے مضامین پولیٹیکل سائنس اور اکنامکس تھے۔ اسی سال میں نے بھی بی اے (آنرز) انگریزی میں داخلہ لیا تھا۔ میرے دوسرے مضامین اردو اور اکنامکس تھے۔ اگلے سال میں نے Main Subject انگریزی کے بجائے اردو کرالیا تھا۔ مجھے آفتاب ہال کا ممتاز ہوسٹل الاٹ ہوا تھا۔

آفتاب ہال اور امیر منزل کو جوڑنے والا علاقہ شمشاد مارکیٹ کہلاتا تھا جو ہمیشہ کی طرح شام کو آباد رہتا۔ انوپ شہر، قلعہ اور جیل روڈ کے مثلث پر واقع اس بازار میں آفتاب ہال، سرسید ہال اور سلیمان ہال کے طلبا کی طرح امیر منزل کے طالبعلم بھی اسی طرف آتے اور چائے خانوں کی رونق بڑھاتے۔ سیون اسٹار، رائل، کیفے اور ٹی ہاؤس سے ممتاز، جئے جوان جئے کسان تک ایک عجب رومان پرور ماحول رہتا۔ دھیمی آواز میں ریکارڈنگ ہوتی رہتی۔ جیسے جیسے طلباء کا گروپ بدلتا رہتا، نغموں کی فرمائشیں بھی تبدیل ہوتیں۔ دیر رات تک اس محفل میں نظر آنے والے ادیبوں، شاعروں کے علاوہ طلباء ہوتے جو مقابلہ جاتی امتحان کی تیاری کررہے ہوتے اور یہاں کے خوشگوار ماحول سے فریش ہونے کے بعد پھر اپنے کمروں میں بند ہو جاتے۔ سینئر حضرات کبیر اور ملا غفور کے بہی کھاتوں میں اپنے حساب کو اکثر نسیم قریشی صاحب یا پھر سید امین اشرف صاحب کے نام درج کرادیتے۔ وہ بھی اس شان سے جیسے ان پر احساس کررہے ہوں۔

مہتاب حیدر نقوی زیادہ تر اسی علاقہ میں نظر آتے تھے۔ حالانکہ وہ اکثر بزرگوں کی محفل میں بھی شریک ہو جاتے جو 'ہم سخن' کے نام سے مشہور تھی اور جس کا مرکز دودھ پور کا قرب و جوار ہوا کرتا تھا اور جہاں خلیل صاحب، وحید صاحب، شہریار صاحب کی صحبت میں نئی نسل سننے اور سنانے کے لئے بیتاب رہا کرتی۔ قاضی عبدالستار صاحب اس وقت آنند بھون کے ایک حصے میں رہتے تھے جن کا گھر بھی ادبی محفلوں کا مرکز تھا۔

۱۵ر جنوری ۱۹۷۷ء کو رشید احمد صدیقی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ سبھی تار والے بنگلے میں موجود تھے۔ ادب کی بڑی بڑی ہستیاں آ جا رہی تھیں جن کے ناموں سے تو ہم واقف تھے مگر اکثر کو پہچانتے نہیں تھے۔ سلمیٰ آپا کا انتظار ہو رہا تھا۔ اسی بیچ دیکھا کہ ہمارے ہم وطن سید مہدی حیدر صاحب خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کے ساتھ رکشے پر بیٹھے ہوئے کہیں جا رہے تھے۔ مہتاب حیدر نے انہیں دیکھتے ہوئے حسرت بھرے لہجے میں کہا کہ کاش ہمیں بھی خلیل صاحب سے اسی طرح کا قرب میسر ہوتا...... دعا قبول ہوئی خلیل صاحب سے ان کی بے پناہ محبت کا علم مجھے یکم جون ۱۹۷۸ء کو ہوا۔ پورے کیمپس میں آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی کہ علی گڑھ کے لائق فرزند، رشید احمد صدیقی کے چہیتے شاگرد، اردو کے نامور شاعر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی دن کے دو بجے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ رات عشا بعد تدفین ہونی ہے۔ تعطیل کا زمانہ تھا۔ ہوسٹل تقریباً خالی تھے۔ مقابلہ جاتی امتحان کی تیاریوں میں سر کھپانے والے یا پھر ریسرچ اسکالرس کیمپس میں موجود تھے۔ لو کے جھکڑ چل رہے تھے۔ آسمان آگ برسا رہا تھا، زمین تمازتِ آفتاب سے تپ رہی تھی۔ اس ہو کے عالم میں مہتاب حیدر حواس باختہ 'باغ اردو' میں ادھر ادھر چکر کاٹ رہے تھے۔ کیا کرنا ہے؟ شاید یہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ حیرانی و پریشانی کی یہ کیفیت ان پر کئی دن طاری رہی جس کا اظہار 'خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں' ایک نظم کی صورت میں ہوا:

خدا کے فرشتے
سبھی آسمانی کتابوں کو سر پر اٹھائے ہوئے
تیز قدموں سے نیچے اترتے چلے آ رہے ہیں
کہ کشتی
ہواؤں کے رخ پر رواں ہو گئی ہے!
ورق در ورق سب کتابیں

زمیں سے فلک تک بکھرتی چلی جا رہی ہیں
ہوائیں بہت تیز ہونے لگی ہیں
کوئی اپنی کشتی کو بپھرے ہوئے تند دریا میں ڈالے
ہمیں یہ گماں تھا
کہ ہم آسمان وزمیں کے
ہر اک راز سے خوب واقف ہیں
اور علم والے ہیں
لیکن
کہیں سے مسلسل صدا آرہی ہے
''کہ سب وہم تھا
جھوٹ کہتے تھے تم
ہاں ازل کے اسیروں میں
اک تم بھی تھے''
اور پھر......
سارا منظر بدلنے لگا
لوگ رونے لگے
کہ کشتی ہواؤں کے رخ پر
رواں ہوگئی ہے
خدا کے فرشتے
سبھی آسمانی کتابوں کو سر پر اٹھائے ہوئے
تیز قدموں سے نیچے اترتے چلے آرہے ہیں

مہتاب حیدر سے میری ملاقات کے دو ہی مرکز تھے ایک تو فیکلٹی آف آرٹس اور دوسرا شمشاد مارکیٹ۔ دونوں ہی جگہ میری ان سے عموماً رسمی گفتگو ہوتی۔ شاید اس وجہ سے کہ ہم دونوں خاموش طبع تھے مگر اکثر یہ تکلف شمشاد مارکیٹ کے قرب وجوار میں اس وقت بے تکلفی میں بدل جاتا جب آشفتہ چنگیزی، فرحت احساس، جاوید حبیب، ابوالکلام قاسمی، شارق ادیب، عبید صدیقی، پرویز جعفری، آصف نقوی وغیرہ کے مابین بحثیں شروع ہو جاتیں۔ ہمارا یہ مرنجاں مرنج شاعر

اس وقت تو اور بھی چمکتا ہوا نظر آتا جب سید محمد اشرف، طارق چھتاری، علی امیر، خورشید احمد، نسیم صدیقی، عقیل احمد، غضنفر علی، کفیل احمد، ابن کنول، طارق سعید، غیاث الرحمٰن، اظہار ندیم، اسعد بدایونی وغیرہ موجود ہوتے۔ بحثوں کو گرمادینے کا رول ''بوم کلب'' ادا کیا کرتا تھا۔ اس پر اسرار کلب سے یوں تو بہت لوگ وابستہ تھے لیکن سرگرم عمل چند نوجوان ہی تھے۔ احمد سورتی صاحب (کنوینر، جنرل ایجوکیشن سوسائٹی، علی گڑھ) کی حیثیت گاڈ فادر کی تھی۔ بزرگ ہونے کے باوجود ان نوجوانوں کے رت جگوں میں شامل ہوتے اور ان کی ہمت افزائی کرتے۔ طلبا میں ایک شخص ایسا بھی تھا کہ لفظ بوم جس کے نام کا حصہ بن گیا تھا۔ موصوف کا نام نذیرالدین چشتی تھا مگر مشہور نذیر بوم کے نام سے تھے۔ وہ بی یو ایم ایس کے طالب علم تھے۔ سرسید ہال کے ویسٹ ہوسٹل میں رہتے تھے۔ مذکورہ بالا طلبا کے دم خم سے نہ صرف یہ محفلیں آباد تھیں بلکہ مستقبل کے یہ فنکار لٹریری کلب، سنڈے کلب اور کارواں کلب کے تحت ادبی ماحول کو پروان چڑھا رہے تھے۔

کینڈی ہال میں لٹریری کلب، ڈرامہ کلب، میوزک کلب، گریٹ بک کلب، رائٹرس فورم وغیرہ کے تحت ہر دن کوئی نہ کوئی ادبی، ثقافتی پروگرام ہوا کرتا تھا۔ لٹریری کلب سب سے زیادہ فعال تھا۔ سید محمد اشرف، پیغام آفاقی، عبید صدیقی، سبطین اخگر وغیرہ نت نئے منصوبے بنایا کرتے تھے۔ ۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ ''نثری نظم'' کے چرچے تھے۔ صدر اسٹوڈینٹس یونین جاوید حبیب نے جو کہ خود نثری نظمیں لکھ رہے تھے، یہ تجویز رکھی کہ اس موضوع پر مذاکرہ کروایا جائے اور جگہ کینڈی ہال کی لائبریری کا یہی اوپری حصہ ہو جہاں ہم سبھی اکٹھا تھے۔ شہریار صاحب نے اس کا پورا خاکہ تیار کراوایا اور مہتاب حیدر انچارج بنائے گئے۔ مہتاب نے شہریار صاحب کے ایما پر مباحثہ کا انعقاد کیا۔ انیس اشفاق جو اس وقت لکھنو یونیورسیٹی میں ریسرچ اسکالر تھے، مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو کئے گئے۔ حسن عسکری صاحب نے صدارت فرمائی۔ مختلف شعبوں کے طالب علموں سے اہم شاعروں کی نثری نظموں کی قرأت کرائی گئی۔ معاصرین نے نثری نظمیں پڑھیں۔ وحید اختر، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، ابوالکلام قاسمی، فرحت احساس وغیرہ نے محفل کو بیحد گرمایا اور نثری نظم کے مستقبل کو کچھ اس طرح پیش کیا کہ ہفتوں کیمپس میں بس اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی اور مہتاب کو اس مباحثہ پر خوب داد ملتی رہی۔

خیموں میں بٹا ہوں یہ دور لاکھ اختلاف کے باوجود سنہری دور کہلانے کا مستحق ہے۔ جہاں ایک طرف قاضی عبدالستار کی رہنمائی میں فکشن پروان چڑھ رہا تھا وہیں شہریار کے

سایۂ عاطفت میں شعری ماحول فروغ پارہا تھا۔ مہتاب حیدر رفتہ رفتہ شہریار کے بیحد قریب ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ علیگڑھ میں موسم کی طرح تعلقات بدلتے ہیں اور حسب ضرورت وفاداریاں منتقل ہوتی ہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ وادیٔ سر سید میں ایثار اور بے لوث دوستی کی بھی انگنت مثالیں ملتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کسی بھی صورت میں فنکار ادبی فضا کو بگڑنے نہیں دیتے ہیں۔ عہد ماضی میں ان رواداریوں کا بھی خاصا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ پروفیسر خورشید الاسلام کا شعری مجموعہ ''شاخ نہال غم'' منظر عام پر آیا۔ رسم اجرا کے تعلق سے قاضی عبدالستار نے ایک جلسہ منعقد کروایا۔ خورشید صاحب صدر شعبۂ اردو تھے۔ بڑے کروفر کے آدمی تھے۔ سلیکشن کمیٹی کا زمانہ تھا لہٰذا کسی نے یہ تجویز رکھوائی کہ خلیل صاحب سے تقریر کرائی جائے۔ شاید یہ سوچ کر کہ وہ انکار کر دیں گے۔ پروفیسر شفیع صاحب (P.V.C) کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ اطہر پرویز صاحب نے شخصیت اور فن پر گفتگو کی۔ ابوالکلام قاسمی صاحب نے معیاری مضمون پڑھا لیکن خلیل صاحب نے نہایت مدلل انداز میں مجموعہ کے فنی نکات کے توسط سے بہت اچھی مگر سخت تقریر کی جو ان کے مزاج کے عین مطابق تھی۔

قاضی صاحب شمشاد مارکیٹ میں پیراڈائز اور کتاب گھر کے اوپر یونیورسیٹی کے مکان میں منتقل ہو چکے تھے۔ نعیم احمد صاحب آفتاب منزل میں رہتے تھے۔ دونوں کی سرپرستی میں ۱۹۷۸ء کے آخر میں ''سنڈے کلب'' قائم ہوا، جس کے اولین ممبر شارق ادیب، نرجس فاطمہ، طارق سعید وغیرہ تھے۔ مہتاب حیدر کو اس کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ مہتاب کے نام پر سبھی حیرت زدہ تھے کیوں کہ خلیل صاحب کے انتقال کے بعد بہت سے ادیب قاضی صاحب سے ناراض تھے اور کچھ انہیں ان کی موت کا بالواسطہ طور پر ذمہ دار بھی سمجھتے تھے۔ ایسی صورتحال میں ہم سب سمجھ رہے تھے کہ شہریار صاحب مہتاب سے بازپرس یا تنبیہ کریں گے مگر شہریار صاحب نے ہمیشہ کی طرح فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ اس عہدے کو سراہتے ہوئے انہیں مبارک باد دی اور کہا کہ آپ طلبا کے لئے سبھی استاد برابر ہیں، اختلافات کو ہم لوگوں کے حصے میں رہنے دیجئے۔

''سنڈے کلب'' کی سکریٹری ہونے سے چند ماہ پہلے مہتاب حیدر نقوی کی شادی اپنے آبائی وطن میں جعفر عباس صاحب کی بیٹی معصومہ فاطمہ سے ہوئی۔ رشتے میں یہ ان کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ یہ شادی ان کی دادی کی پسند سے کرائی گئی تھی جو ہمیشہ کے لئے مہتاب کی پسند بن گئی۔ ۱۹۸۰ء میں وہ ایم اے میں داخلہ لیتے ہیں لیکن حاضری کے رجسٹر میں نام درج کراتے ہی اپنے دوست صلاح الدین پرویز کے کہنے پر ملازمت کے سلسلے میں ریاض (سعودی عرب)

چلے جاتے ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں واپس آتے ہیں۔ اس دوران بیگم صاحبہ (معصومہ فاطمہ) کھٹی میٹھی یادوں کو سمیٹے ہوئے گاؤں میں اپنے گھر میں رہتی ہیں۔ تین سال کے وقفے کی وجہ سے مہتاب کو داخلہ نہیں مل پاتا ہے لہذا وہ سول سروس کے لئے مقابلہ جاتی امتحان کی تیار میں لگ جاتے ہیں اور پھر Over age ہونے پر کاروبار میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں پہلا بیٹا میر حسن، ۱۹۹۱ء میں میر اسد اور ۱۹۹۶ء میں میر حسین پیدا ہوا۔ ان تینوں بچوں کی ولادت علیگڑھ میں ہوئی۔ انہوں نے ۱۹۹۰ء میں آگرہ یونیورسیٹی سے پرائیوٹ ایم اے اردو میں کیا۔ علیگڑھ مسلم یونیورسیٹی سے ۱۹۹۲ء میں ایم فل اور ۱۹۹۴ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا موضوع ''ناصر کاظمی کی شاعری کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' اور نگراں ڈاکٹر عقیل احمد صدیقی تھے۔ پی ایچ ڈی مکمل ہوتے ہی احباب کی خواہش ہوئی کہ وہ شعبۂ اردو سے منسلک ہو جائیں مگر ہوا موافق نہیں تھی، خودداری مانع تھی۔ ایسے میں شہریار صاحب کی سرپرستی ان کے لئے نہ صرف طمانیت اور ذہنی آسودگی کا سبب بنتی رہی بلکہ آفات ارضی وسماوی سی آزمائشوں سے نبرآزما ہونے کا سلیقہ بھی سکھاتی رہی اور آخر کار شہریار صاحب نے صدر شعبۂ اردو کی ذمہ داریوں کو سنبھالتے ہی مہتاب حیدر کا (۱۹۹۶ء میں) بحیثیت لکچرر تقرر کیا جس کی پذیرائی تمام ادبی حلقوں میں ہوئی۔ موصوف نہ صرف شروع سے ہی ایک تجربہ کار استاد کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں بلکہ شعبہ کے وقار میں اضافہ کر رہے ہیں۔

خوش اطوار اور خوش اخلاق مہتاب حیدر کے چہرے سے متانت ٹپکتی ہے مگر طبع ظریفانہ ہے۔ ان کے کردار کا نمایاں وصف انکساری ہے۔ دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تو نہیں لیکن بیشتر ان ہی کی طرح حاضر جواب، بردبار اور ملنسار ہیں۔ موقع سے مطابقت رکھنے والے لطائف کا ذخیرہ رکھتے ہیں بلکہ موقع ومحل کے حساب سے تیزی کے ساتھ گڑھ بھی لیتے ہیں۔ بے تکلف محفلوں میں بھی وہ اپنے دوستوں کا خیال رکھتے ہیں کہ ان کے کسی رویے سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ میں نے کسی کو ان سے شاکی نہیں پایا اور بیزار نہیں دیکھا۔ انہیں رکھ رکھاؤ کے ساتھ بات کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ خاص طور سے احباب کی موجودگی میں تھوڑے وقفے سے مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے ہیں۔ صاف گو، کشادہ دل اور وسیع النظر انسان ہیں۔ اصرار پر مشاعروں اور نشستوں میں شرکت فرماتے ہیں اور تحت میں پڑھتے ہیں۔ طبع بچپن سے ان کی موزوں تھی۔ مہتاب کو میں جس رنگ میں ایک طویل عرصہ سے دیکھ رہا ہوں وہ رنگ ہے سادگی کا، خاکساری کا، محبت کا، مروت کا۔ فرق یہ آیا ہے کہ پہلے عینک نہیں لگاتے تھے مگر اب وہ بھی

دامن گیر ہے اور زاویوں کو بدلنے کا مطالبہ کرتی رہتی ہے:

سنتا ہی نہیں کوئی شرافت میں ، ہماری
کچھ اور کجی چاہئے عادت میں ہماری

نیا سفر ہے نئے بادبان کھولے جائیں
نئی زمیں پہ نئے آسمان کھولے جائیں

یہ اندھیرے ، یہ اجالے ، یہ بدلتی صورت
سارے منظر نظر آتے ہیں تمہاری صورت

آؤ یہ خاموشی توڑیں، آئینے سے بات کریں
تھوڑی حیرت آنکھ میں بھرلیں تھوڑی سی خیرات کریں

اسی کے حصے میں حیرتیں ہیں
ہیں جس قدر جس کے پاس آنکھیں

نقوی کے کردار میں غیرت اور خودداری کا رنگ بہت گہرا ہے۔ ان کو میں ولی تو نہیں سمجھتا مگر بنیادی طور پر وہ مذہبی ضرور ہیں، اس اعتبار سے کہ عزت سادات کا لحاظ رکھتے ہیں۔ آل رسول سے عقیدت ہے اور رسول کی محبت تو ان کی رگوں میں خون بن کر رواں ہے۔ ان کی مذہبیت محدود اور تنگ نظر نہیں ہے اسی لئے انسانی محبت اور رواداری ان کی شخصیت پر غالب ہے۔ دراصل ان کی شخصیت میں ذہانت وفطانت اور محبت کا بہت اچھا امتزاج ہے جس سے ان کی شاعری میں بھی نکھار آیا ہے۔ بقول عقیل احمد صدیقی:-

> "...... یہ خواب، حیرت اور تعجب کے لمحوں میں لکھی گئی، خوابناک فضا اور لیریکل احساس کی حامل 'خالص شاعری' ہے۔ یہ شاعری انتہائی ذاتی ہونے کے باوجود انتہائی خود مختار ہے۔ مزید براں یہ کہ اپنے قاری کو رفعت کا احساس دلاتی ہے۔"

"شب آہنگ" اور "ماورائے سخن" میں شامل کلام نہ صرف متاثر کرتا ہے بلکہ روایت اور

نئے پن کے حسین امتزاج کا احساس دلاتا ہے اور یہ بھی باور کراتا ہے کہ الفاظ پر قدرت، خیال میں ندرت اور انداز میں انوکھا پن ہے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین کے الفاظ میں:-

''اپنی اس منفرد آواز کی آبیاری میں نقوی نے غایت احتیاط اور ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے۔ روایت کے مستحکم حصار میں انفرادیت کے دریچے کھولنا اور مانوس لفظیات کے ذریعہ سیاق وسباق کی خفیف تبدیلی سے، پیش منظر میں لطیف ارتعاش پیدا کر دینا نقوی کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ تجربے کی تہداری، سریت، دروں بینی اور لہجے کی دلآسائی سے نقوی نے ایک ایسی آواز دریافت کر لی ہے جو آوازوں کے ہجوم میں بخوبی پہچانی جاسکتی ہے۔''

اپنے تخلیقی سفر کے آغاز سے تا ایں دم، وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں۔ ''ماورائے سخن'' کے حرف آغاز میں لکھتے ہیں:-

''یہ شاعری میرے خوابوں سے عبارت ہے کہ میرے رت جگوں کا نتیجہ، اس میں سماجی سروکار ہے یا یہ سارا کھڑاگ محض برائے شعر گفتن ہے؟ مجھے اس کا علم نہیں، مجھے تو اپنے دکھوں میں مگن رہنے کی عادت ہے جس کا اظہار تخلیقی سطح پر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مزید یہ کہ 'جز مشق سخن کار دگر ہی نہیں آتا' کے مصداق کار سخن میں مصروف ہوں۔''

کار سخن میں مصروف یہ فنکار اگر چہ دوسری اصناف پر بھی طبع آزمائی کرتا رہتا ہے مگر خاص میدان غزل ہے۔ غزل کے نئے آہنگ سے روشناس اس شاعر نے اپنے اظہار پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی ہے بلکہ ''من کی دنیا میں ڈوب کر'' اپنے اظہار کو غزلوں کے پیکر میں ڈھلنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اسی لئے کلام میں قوت بیان اور قوت اظہار کا ایک بہتا ہوا دریا نظر آتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

سطح زمین پر کھڑا حرف کمال میں ہوں گم
اپنے خدا پہ میں نثار اس کے جلال میں ہوں گم

دل میں ہمیشہ یہ خلش رہتی ہے رات دن مرے
کل کی کوئی خبر نہیں، ماضی و حال میں ہوں گم

میرا جنون شوق کیا ، میرا کمال ذوق کیا
اپنے خیال میں ہوں گم ،اپنے جمال میں ہوں گم

کیسے لکھوں میں شاعری ، کیسے کروں یہ ساحری
ایک زمانہ ہوگیا لفظوں کے جال میں ہوں گم

انتخاب الفاظ میں مہارت ،عروض و بلاغت پر دسترس اور مصرعے موزوں کرنے کا سلیقہ مہتاب حیدر کو آتا ہے۔اسی لئے اسلوب میں جدت اور طرز ادا میں ندرت ہے۔ان کے کلام میں فلسفیانہ حقائق کی گہرائی ،سماجی اور معاشرتی تقاضوں کا احساس ،تاریخی واقعات کے ساتھ ماحول کی عکاسی اور جمالیاتی پہلو بھی جلوہ گر ہے:

زندگی کیا ہے بجز وہم و گماں میرے لئے
یہ زمیں جب ہوگئی بے آسماں میرے لئے

شہر میں لگتی ہے، پھر اک روز بجھ جاتی ہے آگ
چھوڑ جاتی ہے مگر سارا دھواں میرے لئے

اپنی خاطر ستم ایجاد بھی ہم کرتے ہیں
اور پھر نالہ و فریاد بھی ہم کرتے ہیں

کیسی یہ آنکھیں ہیں انکے رنگ ہی کچھ اور ہیں
ان جھروکوں سے کوئی دیکھے بھلی لگتی ہے دھوپ

یہی کہ اب کے بھی ہم لوگ سرخ رو ہو جائیں
سو داستان وطن خوں چکاں بناتے ہیں

ایک صحرائے ہوس ہے مرے دل کے اندر
یوں ہی شاداب رہیں تیرے گلاب اپنی جگہ

کون سے منظر کی تابانی اندھیرا کر گئی
ایسا کیا دیکھا کہ اب آنکھوں میں بینائی نہیں

ایک میں کیا کہ مہ و سال اڑے جاتے ہیں
اے ہوا! تجھ سے زمانے میں بچی ہے کوئی چیز

عشق نے خود رخ گلنار کو بخشا ہے فروغ
ورنہ کب اپنے بنائے سے بنی ہے کوئی چیز

سبھی کو شوق شہادت تو ہو گیا ہے مگر
کسی کے دوش پہ سر ہی کہاں سلامت ہے

دکھ سکھ، نشیب و فراز، بلندی اور پستی یہ سب زندگی کے مختلف روپ ہیں کیوں کہ زندگی دھوپ چھاؤں کے مانند ہوتی ہے اور شاعر اسی سے متاثر ہو کر اپنی شاعری کو پروان چڑھاتا ہے اور نئے نئے اشعار خلق کرتا ہے۔ معاصر منظر نامے میں مہتاب حیدر نقوی ایسا ہی ایک نام ہے جس نے قرب و جوار کے تمام دکھوں کو اپنی شاعری میں سمیٹ کر دوسروں کے نام مسکراہٹیں وقف کر دی ہیں۔ خود کی رات بسر کی لیکن اوروں کے لئے صبح کی روشنی چار سو پھیلائی:

ہمارے سکھ بہت کم اور دکھ ان سے بہت ہم ہیں
سو ہم بھی آج کل ان کی نگہداری میں رہتے ہیں

دکھ سکھ کے پس منظر میں ادب کی نگہداری ان کو نہ صرف اپنے ہم عصر شاعروں میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے بلکہ مخصوص اسلوب کی حلاوت کی وجہ سے غزل گو شعرا کی طویل قطار میں ان کا مہتابی چہرہ بڑی آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے:

راہ مضمون تازہ بند نہیں
تا قیامت کھلا ہے باب سخن

○○

ہم سے پوچھو کوئی فسانۂ گل

عبدالصمد

اس زمانے میں وہ گیا آتے تو پروفیسر شاہ شکیل احمد کے ہاں بھری محفل میں وہاب اشرفی کے ساتھ ایک گوشے میں بیٹھ جاتے...... دھیمی دھیمی سرگوشیاں اور بلند بام قہقہے...... اور لوگوں کے بارے میں تو پتہ نہیں لیکن ہم جونیئر قسم کے لوگ حونقوں کی طرح جس تس کا منہ تکا کرتے اور دلوں میں خواہ مخواہ گمان گزرتا کہ کہیں ہمارے تو سینگ نہیں نکل آئے۔ آج خیال آتا ہے تو بہت ہنسی آتی ہے، یعنی ہم بھی شاید کچھ تھے......

ان سرگوشیوں اور تیز قہقہوں کو اس وقت لگام لگتا جب ایک بلند آواز انہیں چپ رہنے اور دوسری باتیں کرنے کا حکم دیتی۔ یہ بلند آواز کلام حیدری کی ہوتی تھی۔ یوں اس محفل میں شاہ شکیل احمد بہ نفس نفیس موجود ہوتے تھے لیکن ان کا کام مسکرانے کے سوا کچھ نہ ہوتا...... کیا کام محبت میں اس آرام طلب کو۔

شفیع جاوید بڑی آہستگی سے بڑے بڑے عہدوں کو پار کرتے جا رہے تھے، ہم پر ان کی افسانہ نگاری کا دھونس تو تھا ہی، کچھ ذہن میں آفیسری کا رعب بھی جمنے لگا تھا۔ ہم انہیں بڑی خوفزدہ نگاہوں سے دیکھا کرتے۔

وہ گلابی جاڑوں کی ایک خوبصورت شام تھی۔ مقام تھا مہندرو گھاٹ پٹنہ کے کیے میریا کے اوپری حصے کا وہ گوشہ جو شیشوں سے مزین تھا، گنگا نے اس وقت تک اپنا منہ نہیں موڑا تھا اور اس میں دور دور تک روشنی کی تتلیاں کھیلا کرتی تھیں۔ موقع تھا برادر بزرگ جناب احمد یوسف کی

حکم طلبی کا۔ ہم یعنی وہ خود، شفیع جاوید، ظہیر صدیقی، علی امام،...... ہم چائے پی رہے تھے، گرم گرم پکوڑیاں پلیٹوں میں ہمک رہی تھیں۔ احمد یوسف صاحب کا کہنا تھا کہ ہمیں کبھی کبھی یوں بیٹھنا چاہئے۔ ہم سر ہلا ہلا کے ان کی رائے کا احترام کر رہے تھے۔

باہر نکلے تو رات ابھی ابھی جوان ہوئی تھی۔ شفیع جاوید کو کنکڑ باغ جانا تھا، مجھے راجندر نگر۔ سوچا رعب دار آفیسر کے پاس گاڑی تو ہوگی ہی، مزے میں گھر پہنچ جاؤں گا۔ لیکن وہاں گاڑی کا دور دور کوئی نشان نہیں تھا اور آفیسر صاحب کے پیروں میں باٹا کی مضبوط چپل تھی۔ سب خراماں خراماں سبزی باغ آئے، وہاں اور لوگوں کی راہیں الگ ہوئیں اور ہم نے پیدل اپنا راستہ پکڑا۔ رعب کچھ کم ہوا۔ کیا آفیسر ہیں سڑکوں پر چپل چٹخاتے پھرتے ہیں، ہمت دیکھئے اس عالم میں وہ کنکڑ باغ جائیں گے...... اتنی دور، میرا کیا ہے میں تو آدھے ہی راستے راجندر نگر میں رک جاؤں گا۔

راستے میں مجھ پر کم ہوتا ہوا رعب اور ان پر خاموشی طاری رہی۔ جو باتیں بھی ہوئیں تو بس ہوں ہاں میں۔

میرا گھر آگیا۔

"السلام علیکم......"

"وعلیکم السلام......"

اتنی چھوٹی سی رفاقت اتنی جلدی ختم ہوگئی۔

باٹا کی چپل اور سڑکوں پر پیدل مارے پھرنے سے جو بدرعبی پیدا ہوئی تھی، وہ پھر عود کر آئی...... احساسات سے آلودہ......

مانا کہ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں، مگر اس کے معنی یہ تو نہیں کہ چھوٹے اور معمولی افسانہ نگاروں کو ایک دم حقیر سمجھیں......

چائے کی میز کی گرد بیٹھ جانا اور سڑکوں پر پیدل چلنا دکھاوا ہے...... صرف دکھلاوا......

اصل چیز ہے...... بڑا آفیسر اور بڑا افسانہ نگار......

دو ماہی "الفاظ" علیگڑھ کو پروفیسر اطہر پرویز ایڈٹ کرتے تھے۔ مجھ سے فرمائش کی کہ میں پروفیسر کلیم الدین احمد سے ایک انٹرویو کرلوں۔ ادب کے ایک نووارد کے لئے یہی بہت بڑی بات تھی کہ کلیم الدین احمد کے روبہ رو بیٹھے، ان سے باتیں کرے، ان کو دیکھے اور ان کے ساتھ اپنا وقت بتائے۔ بہت سارا وقت خوش ہونے اور مگن ہونے میں گزر گیا۔ ہمت نہیں جٹتی

تھی۔علی امام کو تیار کیا کہ وہ ہمیشہ سے باہمت اور دوسروں کی ہمت کو بھی سنبھالتا ہے۔علی امام اس وقت تعلیم بالغان کے محکمہ میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر لگے ہوئے تھے۔ان کا دفتر کلیم الدین احمد کے مکان کے پاس تھا،انہوں نے ان کے ملنے کے اوقات وغیرہ کی جانکاری حاصل کی اور ہم ایک سہ پہر اپنی ہمت کو پار کر ہی گئے۔

سوالیہ نگاہیں اٹھیں۔

پتہ تھا کہ زیادہ تمہید سے بات نہیں بنے گی،فوراً مدعا بیان کر ڈالا۔چند لمحوں کی جان لیوا آزمائشی توقف کے بعد لب ہلے۔

''شفیع جاوید بھی کہہ رہے تھے،آپ کے پاس Authorized letter ہے......؟''

''شفیع جاوید کون ــــــ ؟''

میرے منہ سے فوراً نکلا۔اتنا بڑا موقع ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا،بڑے آفیسر اور بڑے افسانہ نگار کو Let down کرنے کا اس سے اچھا موقع اور کہاں ملتا۔

''آپ شفیع جاوید کو نہیں جانتے......؟

ایک معنی خیز تبسم......

اب نہ تو 'نہ' کہنے میں بنے نہ 'ہاں' کہنے میں۔چپ چاپ سر جھکا دیا۔

''تم کو اتنا Hash نہیں ہونا چاہئے تھا......''

باہر نکل کر علی امام نے سرزنش کی۔

''تو اور کیا کرتا،یہ شفیع جاوید کہاں سے ٹپک پڑے......؟''

میں نادم تو تھا لیکن ہاتھوں سے بڑا موقع نکل جانے کا غم زیادہ شدید تھا۔

''کمال کرتے ہو،شفیع جاوید ہم لوگوں سے بڑے تو ہیں ہی،مدیر''الفاظ'' نے سوچا ہوگا کہاں یہ لڑکے،کہاں......''

کچھ دنوں کے بعد علی امام نے انہیں کسی کام سے فون کیا۔

''کس سے بات کرنا ہے بابو......؟''

مخصوص انداز،مخصوص آواز،مخصوص سوال......

''شفیع جاوید صاحب سے......''

علی امام نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''آپ شفیع جاوید کو زندہ مانتے ہیں......؟وہ تو کب کا مر چکا......''

اس کے بعد علی امام نے کیا کہا میں نے یہ جاننے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ اس کے بعد لکا چوری کا کھیل شروع ہوگیا۔ ایک ہی شہر کا واسطہ تھا، کسی نہ کسی تقریب میں آمنا سامنا ہو ہی جاتا۔ میں نگاہیں بچا کر نکل جانے کی کوشش کرتا، وہ نظر انداز کر دیتے۔

یہ سلسلہ بہت دور تک چلا۔

۱۹۹۱ء میں مجھے اردو مشاورتی کمیٹی بہار کا چیر مین بنایا گیا۔ محکمہ راج بھاشا میں میرا بیٹھنا طے ہوا۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر محکمہ تعلقات عامہ کے دفاتر تھے۔ شفیع جاوید ڈائرکٹر تھے۔

ایک دن اچانک میرے چھوٹے سے کمرے میں وہ داخل ہوئے۔

میں زور سے چونکا اور جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''بہت بہت مبارک باد......''

انہوں نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس دوستانہ ہاتھ کو فوراً تھام لیا۔ ہمیشہ کیلئے۔

''ایک چھوٹی سی نصیحت...... ہمیشہ Low profile رکھنا......''

انہوں نے میرے کان میں پھونکا اور باہر کھڑی جیپ میں بیٹھ گئے جس کا انجن شاید بند بھی نہیں کیا تھا۔

یہ نصیحت فوراً تو میرے پلے نہیں پڑی، لیکن اس نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ زندگی میں بہت نشیب وفراز آئے، اس کی معنویت سامنے آتی گئی اور یہ نصیحت ہمیشہ کے لئے پلے بندھ گئی۔ ایک ٹارچ تھا جسے میں اپنے اندر چھپائے رکھتا تھا، گھپ اندھیرا چھا جاتا تو اس کی مدد سے آگے کا راستہ ڈھونڈ نکالتا۔

یوں شفیع جاوید بڑے تنتنے والے آفیسر تھے۔ ماتحت ان کے آگے بھیگی بلی بنے رہتے۔ افسر اعلیٰ بھی احتیاط کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ویسے ایک باوقار فاصلہ بنائے رکھنے میں شفیع جاوید پہلے بھی کمال رکھتے تھے، آج بھی رکھتے ہیں۔

مشتاق احمد نوری نے ایک دلچسپ واقعہ سنایا۔ وہ شفیع جاوید کے ماتحت تھے، اب اسی محکمہ میں ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں۔ ان سے کچھ سسرالی رشتہ وغیرہ کا معاملہ بھی تھا اور نوری اپنی معصومیت میں کبھی کبھی اسے بھنانے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ کسی معاملے میں ان کی کسی افسر سے ٹھن گئی۔ اسے افسری کا زعم، انہیں ڈائرکٹر کی دھونس۔ اس دھونس کی سرشاری میں وہ ایک دن ان کے گھر پہنچ گئے۔ ڈائرکٹر صاحب برآمدے میں تشریف فرما اخباروں کے مطالعے میں مصروف

تھے۔ ماتحتوں کا گھر پر ملنا اور وہ بھی دندناتے چلے آنا پسند نہیں تھا۔ نوری نے سلام کیا، سر کی ایک ہلکی جنبش سے جواب دیا اور ایک نگاہ غلط انداز......

سامنے کی کرسی خالی تھی لیکن بیٹھنے کا اشارہ نہیں تھا۔

''کیا ہے......؟''

جان لیوا انتظار کے بعد سخت لہجہ میں پوچھا گیا۔ طوعاً کرہاً مدعا بیان ہوا۔ جواب ملا، پر خاصی بیگانگی کے انداز میں۔

''Protocol کا خیال رکھا کیجئے۔ وہ آپ کا افسر ہے، جایئے......''

ساری سرشاری ختم، دھونس کی ہوا نکل گئی۔

پتہ چلا کہ وہ دفتر اور گھر کے درمیان فاصلے کو سختی سے قائم رکھنے کے قائل تھے۔ انہیں شفیع جاوید کو نوری کے گھر پر دل کھول کے قہقہہ لگاتے دیکھنے والے بھی بیشمار ہیں۔

کلام حیدری نے ایک واقعہ سنایا۔

''ہم لوگ سبزی باغ میں چہل قدمی کر رہے تھے، شام کا وقت تھا۔ اس وقت سبزی باغ میں ہمیشہ سے کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ سامنے نل پر ایک آدمی خوب مل مل کر نہا رہا تھا۔

میں نے شفیع جاوید سے پوچھا۔

''تم اس طرح ننگ دھڑنگ نہا سکتے ہو......؟''

''نہیں بھائی، توبہ کیجئے......''

''میں نہا سکتا ہوں، شفیع جاوید تمہارے افسانوں کا کوئی کردار اسطرح کھلے بندوں نہیں نہاتا......''

شفیع جاوید نے کیا جواب دیا اس کی مجھے خبر نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کے کرداروں کا رشتہ کہیں نہ کہیں سے حجاب امتیاز علی اور قرۃ العین حیدر کے کرداروں سے ضرور ملتا ہے۔ ان کے کردار مافوق الفطرت نہیں ہوتے، زمین ہی سے جڑے ہوتے ہیں، لیکن زمین کی بھی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ افسانہ نگار جن کرداروں کو جانتا ہے، انہیں کی کہانیاں تو لکھے گا، اس سے یہ توقع کیوں کی جائے کہ وہ پریم چند کے کسان اور منٹو کی طوائفوں پر بھی ضرور لکھے۔

شفیع جاوید سماجیات کے طالب علم رہے ہیں، اسی مضمون میں ان کا ایم اے ہے، مگر انہوں نے ادب کا بے پناہ مطالعہ کیا ہے، نہ صرف اردو ادب کا بلکہ انگریزی اور دوسری یوروپی زبانوں کے ادب کا بھی۔ پڑھنے لکھنے کے معاملے میں وہ پکے یوروپین ہیں، جو چیز بھی زیر مطالعہ آئے، اس کے وہ نوٹس ضرور بنائیں گے۔ ان کے پاس بے شمار ڈائریاں ہیں جو اقوال زریں

سے بھری ہوئی ہیں، لکھتے وات یہ تمام چیزیں ان کے ذہن اور یادداشت میں عود کر آتی ہیں۔ جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں اس کے پس منظر میں جو چیزیں ضروری ہوتی ہیں اور جو انہیں کسی طرح مہیا ہو جائیں، ان کا بہت سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں سے صرف تخلیقیت نہیں علمیت کی بھی بو آتی ہے اور چونکہ شفیع جاوید کو زبان پر عبور حاصل ہے اسلئے ان کی علمیت بوجھ بھی نہیں بن پاتی، رواں، شگفتہ انداز میں Asthetic sence پیدا کرتی ہیں اور ادب کے سب سے اہم منصب کو ادا کرتی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ شفیع جاوید نے اپنی زندگی میں کیا کیا اور کہاں کہاں سمجھوتے کئے، مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ جس Clibre کے آدمی ہیں اس اعتبار سے انہیں کوئی بڑا عہدہ نہیں ملا۔ انہوں نے اپنے گرد ایک لکشمن ریکھا کھینچ رکھی ہے، اس سے وہ کبھی باہر نہیں جاتے۔ سرکار میں کچھ دن مجھے بھی رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ اپنی لکشمن ریکھا کو پار کر جاتے تو کوئی بھی بڑا عہدہ انہیں بآسانی مل سکتا تھا۔

دنیا میں بڑی سی بڑی چیز پانے کی تمنا کس کو نہیں ہوتی، شفیع جاوید کو بھی ہوگی اور وہ بھی کچھ تمنا رکھتے ہوں گے، کبھی کبھی انہوں نے اپنے قدم آگے بڑھائے بھی مگر شاید اسی وقت ان کی لکشمن ریکھا آگ اگلنے لگی اور ان کے قدم وہیں کے وہیں رک گئے۔ جن لوگوں نے آگ کی لکیر کو پار کر لیا، وہ ان سے بازی لے گئے۔ شفیع جاوید کو اس پر بہت جھنجھلاہٹ بھی ہوتی تھی، ان کی جھنجھلاہٹ ان کی سوچ کے ذریعہ قلم کو قوت بخش رہی تھی اور وہ اس معاملے میں تو لکشمن ریکھا کو پار کر بھی جاتے ہیں۔

ان کے یہاں زبان کی جو خوبصورتی ہے اسے دیکھ کر رشک آتا ہے...... بلکہ حسد بھی۔ انہوں نے زبان کی شیرینی کو اپنے اندر اتار لیا ہے، اس کی خوشبو کے پیرہن کو اوڑھ لیا ہے اور اس کی گھلاوٹ کو گھونٹ گھونٹ کر پی گئے ہیں، ہم جیسے لوگ بھلے اپنی کمی اور کجی پر پردہ ڈالنے کے لئے بیدی کی کھردری زبان کا سہارا لیتے رہیں، پر زبان شفیع جاوید جیسی نہیں ہوگی تو وہ پڑھنے والے کی روح کی گہرائیوں میں نہیں اتر سکتی۔ انہوں نے اپنی زبان پر بہت محنت کی ہے، اسی لئے زبان ان کے قابو میں آگئی ہے اور ہم جیسوں کو رشک، حسد اور احساس کمتری میں مبتلا کرتی رہتی ہے، وہ رشک ہی کا عالم تھا جب میں نے اپنے ناول "مہا ساگر" کا مسودہ انکے حوالے کر دیا۔

جی ہاں..... مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں نے اردو باقاعدہ نہیں پڑھی، یوں اردو کے قاعدے پڑھ چکا ہوں لیکن صرف قاعدہ پڑھنے سے کتنی اردو آتی ہے.....

اصل میں میری اردو وہی ہے جو خط کی زبان میں استعمال ہوتی ہے، یعنی اپنے والدین، بھائی بہنوں، اور دوستوں کو جو میں نے خط لکھے بس اتنی ہی اردو مجھے آتی ہے۔ اسی لئے زبان نہیں جاننے کا الزام مجھ پر لگتا ہے تو میں اسے خندہ پیشانی سے قبول کر لیتا ہوں..... کوئی غلط الزام نہیں لگتا تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات......؟

شفیع جاوید سے میں نے اتنی درخواست ضرور کی کہ وہ صرف زبان دیکھ لیں یعنی تذکرو تانیث، قواعد اور محل استعمال وغیرہ۔ وہ اس پر اپنی زبان کی خوبصورتی کا لبادہ نہ ڈالیں۔

انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس ناول کا انتساب میں نے انہیں کے نام کیا، ناول چھپ گیا تو وہ بڑے پریشان۔

"یہ آپ نے کیا کیا —— ؟"

"کیا......؟"

میں واقعی نہیں سمجھا۔

"یہ تو آپ کے اور میرے درمیان کا ایک راز تھا......"

وہ خاصے فکر مند تھے۔ میں ہنس دیا۔

"تو کیا ہوا، میں نے جان بوجھ کر اسے طشت از بام تو نہیں کر دیا، لوگ اس کا کوئی مطلب نکالتے ہیں تو شوق سے نکالیں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا......"

مجھے واقعی کوئی پرواہ نہیں تھی، لیکن انہیں آج تک ہے۔

دوستوں کے ساتھ یوں ان کا سلوک بہت والہانہ ہوتا ہے لیکن اس میں بال پڑ جانے کا اندیشہ ہمیشہ بنا رہتا ہے اور بال پڑ بھی جائے تو پھر شیشے کے ٹوٹ جانے کا خطرہ بھی رہتا ہے، بس خدا کا شکر واقعی ٹوٹ جانے تک نہیں پہنچتی بس تھوڑے سے فاصلے پر رک جاتی ہے۔

شفیع جاوید بیحد حساس ہیں، ہر جینوین فنکار کو ہونا چاہئے، انہیں ذرا سی چوٹ خاص طور پر دوستوں کی جانب سے لگے تو بہت لگتی ہے اور کئی روز تک لگتی رہتی ہے، مگر یہ بھی ان کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے کچھ دوست بھی اس سلسلے میں فراخ دل واقع ہوئے ہیں، انہیں بھی اس کا فوراً احساس ہو جاتا ہے، پھر شفیع جاوید اس چوٹ کو یوں بھلا دیتے ہیں جیسے کبھی لگی ہی نہیں ہو۔ دوسری طرح وہ اپنے واقعی دشمنوں کو آسانی سے معاف نہیں کرتے، ویسے ان کی دشمنی لوگوں کے ساتھ کم ہے، لوگوں کی ان کے ساتھ زیادہ۔ کچھ تو ان کے عہدوں کی دین ہے اور کچھ ان کے اپنے مزاج کا خاصہ۔ وہ ہر کس و ناکس کے سامنے آسانی سے نہیں کھلتے، انہیں سامنے کا دبیز پردہ

اٹھانے میں بہت تکلف ہوتا ہے، کبھی کبھی اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ تیر کمان سے نکل جاتا ہے اور غلط فہمی اور آگے جا کر دشمنی کا ایک رشتہ سا قائم ہو جاتا ہے۔ یوں انہیں ان چیزوں کی مطلق پروا نہیں ہوتی، وہ اپنے کم سے کم دوستوں میں مگن ہیں اور زیادہ سے زیادہ دشمنوں سے بے پروا......

سنتے ہیں مونا لیزا کی مسکراہٹ کا حتمی معنی آج تک پہنایا نہیں جا سکا، ویسے اپنی اپنی فہم، ادراک اور صوابدید کے مطابق ہر کس و ناکس نے اس کے معنی ضرور وضع کئے ہیں۔ شفیع جاوید کو بھی قدرت نے ایک عجیب تحفے سے نوازا ہے...... ان کی مسکراہٹ...... ایک بے حد Mystenious مسکراہٹ......

یہ مسکراہٹ جہاں لوگوں کو خوش فہمی میں مبتلا کرتی ہے دوسری طرف غلط فہمی میں بھی...... معاملہ وہی ہے...... اپنی اپنی فہم، ادراک اور صوابدید......

شفیع جاوید کو بھی لوگوں کو تذبذب میں مبتلا کرنے اور مبتلا رکھنے کا بہت شوق ہے۔ وہ کبھی اپنی مسکراہٹ کا راز، اگر وہ واقعی کچھ ہے، نہیں کھولتے، شاید وہ اپنی مسکراہٹ کو اپنا Asset سمجھتے ہیں۔ ویسے مجھے انصاف کی اونچی کرسی مرحمت کر دی جائے تو میں بلا دریغ یہ فیصلہ ثابت کر دوں کہ ان کی مسکراہٹ میں کوئی راز پوشیدہ نہیں، دوستوں کے لئے یہ مسکراہٹ طاقت کا منبع ہے، دشمنوں کے لئے تلوار۔ جس شخص نے قلم پکڑ لیا ہو، اسے کہاں تلوار، بھالا، لاٹھی سے سروکار، اس کا سب سے بڑا ہتھیار مسکراہٹ ہی تو ہے۔

شفیع جاوید باقاعدہ مطالعہ کرنے والے آدمی ہیں۔ وہ کسی بھی تحریر کو سرسری دیکھ کر آگے نہیں بڑھتے۔ ان کے پاس بے شمار ڈائریاں ہیں جن میں ان کی پڑھی ہوئی تحریروں کے نوٹس موجود ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ وہ جب ادب کے کسی پہلو پر اظہار خیال کرتے ہیں تو بے پناہ اعتماد کے ساتھ، اب یہ بات الگ ہے کہ وہ جلدی کسی موضوع پر اظہار خیال کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے۔

زبان پر ان کی جو قابل رشک گرفت ہے، وہ ریاضت اور محنت سے آئی ہے۔ ان کے آس پاس کئی ڈکشنریاں رکھی رہتی ہیں، انہیں کسی لفظ پر ذرا شبہ ہو تو وہ مکمل طور پر مطمئن ہوئے بغیر آگے نہیں بڑھتے۔ ایسی صورت میں ہم جیسے کاہلوں کے لئے اس کے سوا اور کیا راستہ ہے کہ ان کی ریاضت اور محنت سے ہم بھی کچھ فائدہ اٹھا لیں۔ شفیع جاوید بھلے کسی اور معاملے میں بہت فراخ دل نہ ہوں لیکن اپنے علم کو مفت تقسیم کرنے کو ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں۔

مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے کہ شاید شفیع جاوید اپنے کیریئر کے انتخاب میں چوک گئے۔ انہیں

درس وتدریس کا راستہ اختیار کرنا چاہئے تھا۔ انہوں نے سماجیات (Socilogy) جیسے مضمون میں اس وقت ماسٹرس کیا تھا جب اس مضمون نے مقبولیت کی پہلی ہی سیڑھی پر قدم رکھا تھا اور اس کے لئے یونیورسٹیوں میں نوکری کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ان کا یونیورسٹیوں کے چند اعلیٰ عہدے داروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھی تھا، پھر بھی وہ یونیورسیٹی سروس میں نہیں آئے......

وجہ......؟

انہوں نے کبھی بتائی نہیں۔

وہ گورنمنٹ سروس میں آگئے، وہاں ان کو اپنی عزت ووقار کے لئے زبردست تگ ودو کرنا پڑی۔ انہیں بہار کے ایک فرعون صفت حاکم اعلیٰ سے قانونی لڑائی تک لڑنا پڑی۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ نسبتاً ایک پرسکون نوکری میں جاتے تو...... لیکن آگے کیا کہوں، بے پناہ مصروفیت اور الجھنوں کے بعد بھی تو انہوں نے مطالعہ اور لکھنے پڑھنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی۔ انہوں نے اس سلسلے میں جو معیار وضع کیا، اس معیار تک کیا وہ اس وقت پہنچ سکتے تھے اگر وہ یونیورسیٹی سروس میں جاتے۔ یہ ایک ایسا سوال جس کا جواب شاید ہم جیسے یونیورسیٹی سروس میں جانے والوں کے پاس آسانی سے ملنا مشکل ہے۔ کیا ہم یونیورسیٹی سے تعلق رکھنے والے لوگ اتنی محنت کر سکتے ہیں......؟

ان کے کچھ ''دستوں'' کا خیال ہے کہ شفیع جاوید جوڑ توڑ میں ماہر ہیں، سوال یہ ہے کہ اگر وہ واقعی ہیں (اس مفروضے کو بھی ان کی Mystious مسکراہٹ نے جنم دیا ہے) تو خود اس سے انہیں کیا فائدہ پہنچا اور اپنے دشمنوں کو انہوں نے کیا ضرر پہنچایا ــــــ؟

جو حصول ان کے پاس نظر آتے ہیں، وہ سب تو انہوں نے انتہائی محنت اور جدوجہد کے بعد حاصل کئے۔ رہا دشمنوں کو زک پہنچانے کا تو جو شخص پل میں روٹھ جائے، پل میں من جائے، وہ کیا کسی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ پل میں روٹھنے اور پل میں من جانے کے قصے بھی دلچسپ ہیں لیکن اس قصہ گوئی کا فرض ہی ان کے کسی بے تکلف دوست کے لئے چھوڑتا ہوں کہ شاید میرے منہ سے یہ قصے اچھے نہ لگیں۔

خوشیاں برداشت کرنے اور خوشیاں سہہ جانے والے بہت ہیں مگر غم کے پہاڑ کو صبر وشکر کے ساتھ اپنے کاندھوں پر اٹھانے والے شاذ ونادر ہی ملیں گے۔ ۲۴ راپریل ۲۰۰۸ء کو ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ یہ ایک ایسی شریک حیات کی جدائی نہیں تھی جس کا تقریباً ۵۳ سال تک ساتھ رہا، بلکہ ایک ایسی ساتھی اور دوست کا جانا تھا جس نے ہر اچھے برے وقت، ہر ہر قدم اور

ہر ہر پل میں اس طرح ان کا ساتھ دیا کہ انہیں کبھی محسوس ہی نہیں ہوا کہ وہ اس وقت دراصل کس پل کے اسیر ہیں ۔۔۔ اچھے یا برے کے ۔۔۔ ؟

جو لوگ انہیں قریب سے جانتے ہیں، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے بغیر شفیع جاوید ہمیشہ سے ادھورے تھے اور ہمیشہ ادھورے رہیں گے۔ اس عمر میں زندگی بھر کے ساتھی کا چلا جانا کتنا بڑا سانحہ ہے۔ اسے شفیع جاوید سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔ لیکن یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے بچوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لے رکھا ہے اور وہ بھی ان کے ہاتھوں مکمل سرنڈر کر گئے ہیں۔ یعنی جو دور ان کے بچوں نے اپنے والدین کی گود میں گزارا تھا، وہی دور شفیع جاوید اپنے بچوں کے ہاتھوں گزار رہے ہیں۔ بلا شبہ، اس معاملے میں وہ قسمت کے دھنی ہیں۔ ان کے دوست بھی ہیں، رشتہ دار بھی، لیکن ۲۴ گھنٹوں کی ایک دن کی زندگی میں کوئی ساتھ نہیں دیتا، یہاں تو ابھی باقی ساری زندگی پڑی ہے۔ ہاں مگر بچے ۔۔۔

یوں شفیع جاوید کو خوش رہنا بھی آتا ہے اور صبر کرنا بھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ان میدانوں میں بھی بازی مار جائیں گے۔

○○
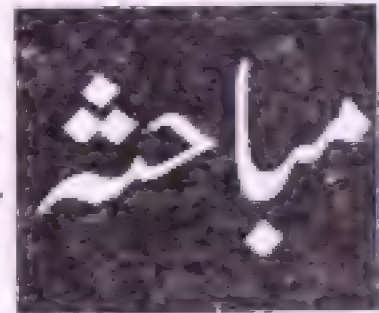
کے اشاعتی تسلسل کو برقرار رکھنے کے لئے

اپنا "غیر مشروط" زر سالانہ ارسال کیجئے

- منی آرڈر کوپن پر اپنا پتہ صاف صاف انگریزی میں ضرور درج کیجئے۔
- ڈرافٹ یا چک "مباحثہ" یا "وہاب اشرفی" کے نام ہی جاری کیجئے۔
- منی ٹرانسفر کے لئے اسی نام کو یاد رکھیے۔
- بیرونی ممالک میں مقیم قارئین WESTERN UNION (MONEY TRANSFER) کے ذریعہ اپنا زر سالانہ ارسال کر سکتے ہیں۔

رفتہ مگر جاوداں: قمر رئیس کی یاد میں

پروین شیر

اس وقت اس قلم میں درد کا لہریں لیتا ہوا سمندر موجزن ہے جس کی بے چین لہریں قرطاس کے ساحل سے ٹکرانے کو بیقرار ہیں لیکن بیکراں سمندر کی صرف چند لہریں ہی تو ساحل تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکتی ہیں۔ سب کہاں —— زندگی بھر یہ زندگی کتنی ناز برداریاں اٹھاتی ہے —— ہم اسے پکارتے رہ جاتے ہیں، روکتے رہ جاتے ہیں۔ اس کی ایک ایک بوند نچوڑ کر سیراب ہونے کی سعی نا کام کرتے رہ جاتے ہیں پھر بھی بے وفا چھوڑ جاتی ہے اور ہم نارسا رہ جاتے ہیں۔ وقت کا گھن جسم کی لکڑی کو رفتہ رفتہ کھوکھلا کر دیتا ہے اور جسم کی دیوار گر جاتی ہے۔ ایک دھماکہ اور گہرا سکوت —— ایک زلزلہ، دیواروں کے ملبے —— اور بس!

ابھی اداس آنکھوں کی زمین پر ماضی کی شبنم قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے۔ ان گنت یادوں کی کرنیں ان قطروں میں سما کر قوس قزح کے حسین رنگوں میں رنگ رہی ہیں۔ ذہن کی دھند چھٹ رہی ہے۔

۱۹۸۵ء کی بہت حسین رات تھی وہ —— پہلی برف باری نے شہر میں ایک نقرئی طلسمی اجالا بکھیر دیا تھا۔ آسمان سفید پھولوں کی نرم پتیاں زمین پر لٹا رہا تھا۔ راہیں سفید نرم پنکھڑیوں سے سنور گئی تھیں۔ اشجار سفید جھلملاتے پیرہن میں سج گئے تھے۔ رات اپنے ہاتھوں میں چاند کا پیمانہ لئے نور کی شراب چھلکا رہی تھی جو برف کی چادر میں ٹنکے ہوئے ستاروں کو اور تابناک بنا رہی تھی۔ جیسے سینکڑوں چاند زمین پر آتر آئیں برف کے ذرے ذرے میں —— وہ رات

ایک یادگار رات تھی۔ونی پیگ (کینڈا) میں بسنے والوں، تمام اردو دوستوں کے لئے ایک اہم ترین رات ـــــــ !

اس رات یہاں کی پاکستانی کینڈین انجمن نے ایک شاندار شام فیض کی یاد میں منعقد کی تھی، جس میں شرکت کے لئے ہندوستان سے قمر رئیس صاحب، پاکستان سے رئیس امروہوی، بزم انصاری اور رضا ہمدانی صاحبان اور لندن سے احمد فراز صاحب تشریف لائے تھے۔یہ سب پہلی بار اس شہر میں تشریف لائے تھے۔شاید اسی لئے جب موسم کی بے رحمی نے زمین کا آنچل پھولوں سے خالی کر دیا تھا تو آسمان نے برف کے نرم پھولوں سے ان کے استقبال کے لئے زمین کا آنچل بھر دیا تھا۔اس رات قمر رئیس صاحب سے ہم لوگوں کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ ایک غیر معمولی انسان نظر آئے۔بردباری، نفاست، راست گوئی، فکر اور قوت ادراک سے ان کی ہمہ جہت شخصیت بھر پور تھی۔نرم اور مشفق لہجہ، خلوص، اخلاق اور مروت سے لبالب، اعلیٰ دانشور اور نقاد ہونے کے ساتھ ایک، اعلیٰ انسان بھی۔قدرت کے تخلیقی کرشموں میں ایک یہ بھی ہے کہ خودرو پودوں کے درمیان ایک ایسا پودا اگتا ہے جس پر خوش رنگ، اور معطر پھول کھلتے ہیں۔یہ پودا اتنا قد آور ہوتا ہے کہ خودرو پودے اس پر حاوی ہو کر اسے نظروں سے اوجھل نہیں کر پاتے۔وہ اپنی قد آوری کی وجہ سے اپنا وجود نمایاں کر لیتا ہے۔اپنے خوش رنگ پھولوں اور خوشبوؤں سے سارے گلستاں کو رنگین اور معطر کر دیتا ہے۔قمر رئیس صاحب ایک ایسا ہی قد آور پودا نظر آئے تھے۔

شام فیض ونی پیگ آرٹ گیلری کے خوبصورت کونسرٹ ہال میں منائی گئی تھی جس میں تقریباً چار سو پچاس (۴۵۰) افراد موجود تھے۔فیض صاحب پر قمر رئیس صاحب نے بیحد معلوماتی اور پر مغز مقالہ پڑھا تھا۔دوسرے دور میں مشاعرے کے دوران قمر صاحب کے یہ اشعار بیحد مقبول ہوئے تھے:

یہ آج ہوا میں جو گھٹن ہے جو امس ہے
کہتے ہیں یہ طوفاں کے لئے حسن طلب ہے
پہچان ہی لے گا یہ لہو دامن قاتل
ہاں حشر کا ہنگام بتادو کوئی کب ہے

اس کے بعد پہلی اور آخری بار وہ ہمارے غریب خانے پہ تشریف لائے تھے۔دراصل میں نے باقاعدگی سے قلم اسی وقت پکڑا جب علی سردار جعفری صاحب (جو ایک سال قبل ونی پیگ

تشریف لائے تھے) کے علاوہ قمر رئیس صاحب نے میری حوصلہ افزائی فرمائی تھی۔ ایک چائنز محاورہ ہے کہ:

Meeting is the begining of parting

لیکن قمر صاحب سے ہم دونوں (میرے شریک حیات سید وارث شیر) کی اس پہلی ملاقات نے اس محاورے کو بدل کر ایک نئی شکل دی کہ:

Meeting is the begining of building bonds

چوبیس سال پہلے کی اُس ملاقات کا ایک چھوٹا سا پودا رفتہ رفتہ خلوص وعقیدت کا ایک تناور درخت بن گیا۔ گاہے بگاہے خط سے رابطہ قائم رہا پھر مصروفیات کی بے رحم حقیقت نے یہ رابطہ ختم کر دیا۔ لیکن ان کا پر خلوص مشورہ کہ میں تخلیق کرتی رہوں اور اشاعت کے لئے بھیجوں مجھے ہمیشہ یاد رہا، جسے عملی جامہ پہنانے کا حوصلہ جاگتا رہا۔

۱۹۸۵ء کے بعد اچانک دوسری ملاقات ٹورنٹو میں ۲۰۰۵ء کی اردو کانفرنس میں ہوئی۔ اسی محبت، اسی خلوص اور گرمجوشی سے ملے۔ برسوں بعد مل کر ہم تینوں (وارث شیر) پچھلی یادیں تازہ کرتے رہے۔ وہی نفاست، وہی انکساری، وہی نرمی اور وہی شفقت، وہی باوقار شخصیت سامنے تھی۔ برسوں بعد تیسری ملاقات ۲۰۰۷ء میں دلی میں ہوئی جب مشیر الحسن صاحب (وائس چانسلر جامع ملیہ یونیورسٹی) نے میری کتاب ''کرچیاں'' کی رونمائی کا اہتمام جامعہ ملیہ یونیورسٹی میں کیا تھا، قمر صاحب کی صدارت میں۔ اسی دوران قمر صاحب نے غالب اکادمی میں بھی میری پذیرائی کی تھی۔ اس باران کا زیادہ ساتھ رہا تھا۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت کے کئی باب وا ہوئے تھے۔ انہیں اور زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور میں نے غور کیا کہ وہ نمائشی اخلاق سے مبرہ تھے۔ انسانی دردمندی کا مجسمہ نظر آئے۔ وہ نقاد، دانشور اور ادیب ہونے کے علاوہ تخلیقی جوہر سے بھی مالا مال تھے۔ اس نئی جہت کا علم مجھے تب ہوا جب انہوں نے اپنا خوبصورت شعری مجموعہ ''شام نوروز'' عطا کیا تھا۔

۲۰۰۷ء میں ان سے چھوتھی ملاقات ہوئی جب وہ شکاگو اردو کانفرنس میں تشریف لائے تھے اور ہم لوگ بھی وہاں اسی غرض سے گئے تھے۔ ہمارے لئے باعث فخر ہے کہ کانفرنس کے بعد وارث شیر اور میں نے ان کے اعزاز میں ایک ادبی محفل کا انتظام کیا تھا جس میں برصغیر انگلستان اور نارتھ امریکہ کے بہت سارے علما وادبا نے شرکت کی تھی۔

پانچویں اور آخری ملاقات —— جس کا ذکر کرتے ہوئے میرا قلم کانپ رہا ہے، دہلی

میں ۲۰۰۸ء میں ہوئی تھی۔ ان کی گرمجوشی اور خلوص نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ دنیا ابھی تک اچھی ہے۔ جہاں قمر صاحب جیسے اعلیٰ انسان موجود ہیں۔ انہوں نے بڑے اہتمام سے میری پذیرائی اردو اکادمی میں کی اور مختلف اردو جلسوں میں عزت دی۔ اپنے دولت کدہ لے گئے، پر تکلف عشائیہ سے نوازا۔ مسز قمر رئیس اور گل سرا صاحبہ (دختر) سے مل کر بھی اجنبیت کا احساس بالکل نہ تھا۔ ان سبھوں کا اخلاق وخلوص ہمیشہ یاد رہے گا۔

اور آج —— وہ ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہیں۔ یہ ایک عجیب دردانگیز احساس ہے کہ میری والدہ کی جدائی ٹھیک ایک سال قبل ہوئی تھی مجھ سے۔ ماں کے چھوڑ جانے پر میری کتاب ''نہال دل پر سحاب جیسے'' کے لئے لکھا گیا قمر رئیس صاحب کا بھر پور مضمون ''خزاں بردوش اداسی کے شگوفے'' ان کے آخری تین مضامین میں سے ایک ہے۔ شاید یہی مضمون آخری ہو، یہ سوچ کر دل چور چور ہے کہ وہ میری اس کتاب کو دیکھ نہ پائے۔ دل یہ جاں گسل سانحہ تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ یہی کہے جاتا ہے کہ نہیں نہیں، ابھی نہیں، اس قدر جلد نہیں —— لیکن زندگی کب کسی کی سنتی ہے؟ ہاتھ جھٹک کر لاکھوں منتوں کے باوجود جسم کے مکان کو سنسان چھوڑ جاتی ہے لیکن —— کچھ زندگانیاں تو روشنی کا وہ منبع ہوتی ہیں جو دنیا کے کونے کونے میں اجالا چھوڑ جاتی ہیں، جن کے جانے کے بعد ان کی روشنی برقرار رہتی ہے جس سے سب فیض یاب ہوتے ہیں۔ قمر رئیس صاحب بھی وہی روشنی کا منبع تھے جو اجالا چھوڑ گئے۔ ان کی قد آور ادبی اور فنی شخصیت شمع کی وہ لو تھی جس کی کرن نہ جانے کتنے ذہن ودل میں اتر کر اجالا کر رہی ہے۔ راستہ دکھا رہی ہے۔ ان کی قوت ادراک اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ افق ادب پر فروزاں ہے اور ہمیشہ رہے گی:

تیرے نقش پا نے بخشا وہ شعور آ گہی
ہوگئی تنویر ہی تنویر میری زندگی

○○

پیاسے رہنے والے

اقبال مجید

میں پوری بستی میں اکیلا بوڑھا جو زندگی کے نبے (۹۰) برس پورے کر چکا ہے۔ میں ابھی بھی دھیرے دھیرے کچھ دور ہوا خوری کے لئے چل لیا کرتا ہوں، بھنی مونگ پھلی چبالیتا ہوں، اخبار پڑھ لیتا ہوں اور میری دور کی یادداشت بھی دھندلائی نہیں ہے۔ آج بجلی کے تاروں سے گھرا آسمان جب یہاں دیکھتا ہوں تو مجھے اس بستی کا وہ صاف ستھرا آسمان یاد آتا ہے جسے صرف گرد و غبار کے بگولے دھندلایا کرتے تھے۔ آج کل میری بستی میں باگیشور ناتھ مندر کے پاس بڑے باغ کی شاہی باؤلی کو مٹی سے پاٹ دیئے جانے کی تجویز خاصی گرم ہے۔ کسی سیاسی پارٹی کا خیال ہے باؤلی کو جوں کا توں رہنے دیا جائے جب کہ بعض گروہ یہ چاہتے ہیں کہ باؤلی اب بے وجہ ہی کافی زمین گھیرے ہوئے ہے، اتنی جگہ پر مچھلیاں پیدا کرنے کا تالاب تعمیر ہو سکتا ہے۔ دراصل وہ شاہی باؤلی معمولی نہیں ہے۔ بچپن میں منڈیر کے کنارے کھڑے ہو کر اس میں جھانکنے سے مجھ پر ہیبت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ میں زور سے آواز لگا کر اس سے آنے والی اپنی آواز کی بازگشت سنتا تھا۔ مشہور تھا کہ غدر کے زمانے میں اس باؤلی کے اندر چھپائے گئے کسی خزانے کے تلاش کرنے کی کچھ ناکام کوششیں بھی ہو چکی تھیں۔ لیکن سب سے زیادہ حیران کن بات اس باؤلی کے پانی کے یکا یک خشک ہو جانے کی مشہور تھی جس میں میرے بچپن میں ایک ہاتھی پانی کا ڈبا ؤ بتایا جاتا تھا۔ میرے باپ منشی برج بھوشن لال جن کی زبان پر اکثر جوالا پرشاد برق کے اشعار اور اقبال کی نظم ہمالیہ رہا کرتی تھی علاقے میں تعلقدار آنجہانی منوہر پرشاد مرحوم کے موروثی کتب خانے

کا انتظام دیکھتے تھے، جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے مذہبی، قانونی اور طب یونانی کی نایاب کتابوں سے مزین تھا۔ دراصل بستی کے پرانے دنوں کی معلومات مجھے خاصی ہے۔ کچھ تو اس معلومات میں اضافہ مجھے اپنے باپ منشی برج بھوشن لال کے اس روزنامچے سے بھی ہوا ہے جسے میں جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ ہلکے ہلکے زرد رنگ کے کاغذ کے اسی روزنامچے سے پہلی بار مجھے یہ انکشاف بھی ہوا تھا کہ اس شاہی باؤلی کے یکا یک خشک ہونے کے پیشین گوئی دلارے میاں نے کی تھی جنکے لئے مشہور تھا کہ آزادی سے بہت پہلے جاڑوں کی راتوں میں کلونیل راج کے ستائے نادار کھیت مزدوروں کو وہ چپکے چپکے کمبل تقسیم کیا کرتے تھے اور جن کے آنگن میں کچھ دیر گاندھی جی نے سنا ہے کہ چرخہ بھی کاتا تھا۔ دلارے میاں کے ٹوٹے پھوٹے مکان کی چھت بستی میں گنا بیلنے والے کولھوؤں کے میدان سے ملحق بیل گاڑیاں بنانے اور مرمت کرنے والے کاریگروں کی دکانوں سے جھانکتی نظر آتی تھی۔ کہتے ہیں کہ دلارے میاں نے فجر کی نماز کے بعد بس یونہی یکا یک ایک دن یہ کہہ کر سب کو سکتہ میں ڈال دیا تھا کہ اس باؤلی میں ایک دن جوان کنواریاں اور نو بیاہتائیں سوئیں گے اور بستی والوں کی آنکھوں کے راستے باؤلی کا سارا پانی بہہ جائے گا اور باؤلی ہمیشہ کے لئے خشک ہو جائے گی۔

دلارے میاں کو میں اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ وہ ان کی زندگی کا آخری زمانہ تھا، ایک نیم پختہ مکان میں رہتے تھے جس کی کمزور دیواروں کی مرمت وہ خود کرتے تھے، انہوں نے شادی نہیں کی تھی، حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کے گھر کا دروازہ کبھی بند نہ ہوتا، اپنی زمینوں سے انہیں کب کیا ملتا تھا اور کتنا دبا لیا جاتا تھا اس کا انہوں نے کبھی کوئی حساب نہ رکھا۔ سوئی سوئی سی بڑی بڑی غلافی آنکھیں، کھڑی ناک شاید ان کا ناک نقشہ بہادر شاہ ظفر کے بڑھاپے کی تصویر سے بہت ملتا جلتا تھا۔ وہ کبھی تعلقداروں کی چوکھٹ پر نہیں گئے اور نہ ان کوٹھیوں کے لق و دق کمروں میں بچھی بے داغ سفید چاندنیوں اور قالینوں پر بیٹھے ہوئے پائے گئے، جن کی چھتوں پر بڑے بڑے رنگین جھالروں کے ہاتھ سے کھینچے جانے والے پنکھے لٹک رہے تھے۔ میں نے دیکھا تو نہیں سنا ہے کہ موٹے اناج کی روٹی وہ شوق سے کھاتے تھے۔ اتنا تو سب ہی جانتے تھے کہ تیوہاروں کے موقعے پر وہ تر تراتی ہوئی ہانڈیوں اور لذیذ پکوانوں کے خوان قبول تو کر لیتے تھے مگر خود نہ کھا کر محتاجوں کو پہنچا دیا کرتے تھے۔ پتہ نہیں لوگ انہیں دبی زبان سے ولی کیوں کہا کرتے تھے جب کہ ایسا تو نہیں کہ انہیں دنیا سے کوئی مطلب نہ تھا۔ پڑھے لکھے تھے، گھر میں اردو فارسی ہی نہیں انگریزی کتابوں کا ذخیرہ تھا اور اس زمانے کے بعض بڑے سیاسی لیڈروں کو کبھی کبھی ان

کے پاس گھٹنوں بیٹھے دیکھا جایا کرتا تھا۔

باؤلی کے بارے میں دلارے نے پیشین گوئی کی حقیقت آرتی مجھ سے معلومات کرنے آئی تھی۔ آرتی بائیس چوبیس برس کی گوری چٹی کائستھ گھرانے کی وہ لڑکی ہے جس کے خاندان کے بزرگوں میں منشی بھگوتی سہائے ہوا کرتے تھے جو فن خطاطی میں ماہر تھے اور منشی نولکشور کے ہزار بار بلانے پر بڑے نخروں سے قرآن شریف کی کتابت کرنے کچھ راستہ پالکی سے اور کچھ پریس والوں کی ٹم ٹم کی سواری سے طے کر کے جایا کرتے تھے۔ بھگوتی سہائے خطاط نے میرے باپ کو بتایا تھا کہ قرآن شریف کی کتابت شروع کرنے سے پہلے ان سے پوچھا جاتا تھا کہ وہ غسل کی حالت میں ہیں کہ نہیں۔ وہاں زمین پر لگے چاندنی کے فرش پر لکھنے کیلئے اپنی نشست جمانے سے پہلے کاتب کو وضو کرنا پڑتا تھا، کمرے کے باہر کشادہ اور صاف ستھرا آنگن تھا جس میں دو بڑے حوض تھے۔ ان میں صاف ستھرے بہشتی گنگا کا پانی بھرتے تھے جن سے چھپائی میں استعمال ہونے والی پتھر کی پلیٹیں اس طرح دھوئی جاتی تھیں کہ پانی نالیوں میں نہ جائے، اس پانی کو دریا میں بہانے کا خاص انتظام تھا۔ کتابت کے کمرے میں ایسے موقعے پر سارے اگالدان اٹھالئے جاتے تھے۔ حقہ استعمال کرنا ممنوع تھا۔

ہماری بستی میں لکھوریوں سے بنی محراب دار برآمدوں اور کھپریل کی چھتوں والی نازک اور نفیس کھمبوں پر ٹکی وہ عمارت جو الگ ہی دکھائی دیتی تھی میرے باپ کے بیان کے مطابق بھگوتی سہائے نے ہی بنوائی تھی۔ اس خوبصورت اور نازک سی کوٹھی کے احاطے میں دو بھاری بھرکم اور گھنے املی کے درخت تھے جن کے نیچے میں اپنے لڑکپن میں درخت سے ٹپکی ہوئی پکی املیاں بٹورنے میں گرمی کی دوپہریں گزارا کرتا تھا۔ سنا ہے ایک زمانے میں بھگوتی سہائے کے خاندان میں اس کوٹھی کو لے کر اندر ہی اندر کچھ کھینچا تانی بھی ہوئی تھی لیکن آرتی کی نانی بملا دیوی نے خاندان میں سب کو قسم دے رکھی تھی کہ ان کے جیتے جی کوٹھی فروخت نہ کی جائے۔ بملا دیوی کا رنگ روپ پرکشش تھا، وہ کھدر پہنتی تھیں، میرے باپ بتاتے تھے کہ بستی سے ایک بار مہاتما گاندھی کا گزر ہوا تو وہ دلارے میاں کی چوکھٹ پر بھی کچھ دیر رکے، وہیں بملا دیوی نے اپنا ایک ایک زیور۔ اور صندوقچے میں پس انداز کی گئی ساری نقدی مہاتما کے حوالے کر دی تھی۔ سنا ہے گاندھی جی نے کہا تھا:

''بٹی تم نے تو سب کچھ مجھے دے دیا۔''

''آپ کو نہیں دیا ہے۔'' بملا نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا'' یہ تو میں اپنے بچوں کے بھوشیہ

کو دے رہی ہوں، ان امیدوں کو دے رہی ہوں جو آپ کے اور میرے سپنے بن چکی ہیں۔''

''سوچ لو، یہ بہت ہے۔'' مہاتما یہ کہہ کر مسکرائے تو بملا نے جواب دیا تھا:

''پر میری پیاس ابھی نہیں بجھی ہے۔ پرمیشور سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ یہ پیاس مرتے دم تک بنی رہے۔'' پاس ہی دلارے میاں بھی کھڑے تھے دھیرے سے بولے 'آمین'

بملا دیوی کی آنکھ بند ہونے کے بعد ان کے ناتی پوتوں میں جائیداد کو لے کر بندر بانٹ ہوئی تو کوٹھی کو ڈھا دیا گیا، جب وہاں نیچے دکانیں اور اوپر رہائشی فلیٹ بنائے گئے اور اس کا کشادہ احاطہ موٹر میکنکوں کو کرائے پر اٹھایا گیا جو املی کے پیڑوں کے نیچے گاڑیاں دھویا کرتے تھے تو وہ منظر دیکھ کر دل سے ایک ہوک اٹھا کرتی لیکن مجھ میں آرتی کے باپ سے بھی کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی جو ایک پارٹی کے ایم ایل اے تھے، بڑی سی رعب دار گاڑی پر ایک باڈی گارڈ کے ساتھ چلتے تھے، کمر میں ریوالور باندھتے تھے اور ان کی تنی ہوئی نوکیلی موچھوں کے پیچھے اور گال کے نیچے خوشبودار تمباکو کا دس روپے والا بیڑا دبا رہا کرتا تھا اور جوز میں دوز کی گئی اس محراب دار عالیشان عمارت کے حصہ داروں میں سے ایک تھے۔ ان کا نام تو رگھو بردیال تھا مگر ساری بستی انہیں پیار سے رگھو بھیا کہہ کر پکارتی تھی، ان کی آمدنی کے ذرائع کچھ تو سب کو دکھائی دیتے تھے اور کچھ پردے کے پیچھے بھی تھے۔ دراصل رگھو بردیال ہی اپنی بیٹی آرتی کو لے کر میرے پاس آئے تھے۔ وہ تاریخ کے موضوع پر ڈی فل کرانے کے لئے اسے ولایت بھیجنا چاہتے تھے تا کہ انڈیا آفس کی لائبریری کی دستاویزوں سے اپنی ضرورت کے حقائق جمع کر سکے۔ آرتی ہمارے علاقے کے کلونیل عہد کی تاریخ کو اپنا موضوع بنا چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ آرتی کی روزمرہ کی پوشاک جینس وغیرہ تھی مگر یہ اس کی شرافت تھی کہ وہ میرے پاس شلوار قمیص میں آتی اور سر دوپٹہ سے ڈھکا ہوتا۔

ایک دن آرتی دلارے میاں کی اس مشہور پیشین گوئی کی تفصیل جاننے کے لئے آگئی جو انہوں نے کبھی پرانی باؤلی کے لئے کی تھی اور وہ سچ ثابت ہوئی تھی۔ وہ معاملہ آرتی کو سمجھانا میرے لئے اتنا آسان تو نہ تھا مگر پھر بھی میں نے اسے یہ بتانے کی کوشش کی کہ کلونیل ہندوستان کے دور میں آزادی کے لئے جدوجہد کرنے والے ہندو اور مسلمان لیڈروں نے آزمائش کے بڑے سخت دن دیکھے ہیں۔ میں نے یہ آرتی کو بتایا کہ میرے باپ نے اپنے روزنامچے میں اپنے علاقے کے بعض ایام کا جو حال بیان کیا ہے وہ بڑا عبرت ناک ہے کیوں کہ بعض زمانے میں یہاں قحط کی سی کیفیت ہو جایا کرتی تھی۔ جب ضلع افسر کا کیمپ لگتا تو غریب کسانوں کے

غول کے غول کیمپ کے باہر کسمپرسی کی حالت میں کھڑے نظر آتے۔ان کی مٹھیوں میں قدرت کی ماری ہوئی مردہ فصل کے کھوکھلے اور سوکھے ہوئے دانے دبے ہوتے جنہیں وہ افسر کے قدموں میں ڈال دیتے اور ہاتھ جوڑ کر منت کرتے کہ ان کا لگان معاف کر دیا جائے، اس تباہ حالی پر انہیں سرکاری ٹکٹ لگا کر درخواستیں دینا پڑتیں اور محرروں کو اجرت بھی اپنی جیب سے ادا کرنی پڑتی۔میرے باپ کے مسلمان دوستوں کا کہنا تھا کہ ہمارا تعلقدار تو زمینداری کے خلاف تھا مگر ایسے چاپلوس مسلمان اور ہندو زمینداروں کی کمی نہ تھی جو انگریز افسروں کی خدمت میں دن رات لگے رہتے تھے۔میرے باپ نے لکھا تھا کہ ہمارے ایک پڑوسی مسلمان زمیندار کی ایسی حرکتوں پر پاسی قوم کے آسامیوں نے اسے ٹھٹھرتی جاڑوں کی رات میں جب وہ جلتے الاؤ کے پاس بیٹھا شراب پی رہا تھا جان سے مار کر آگ میں جھونک دیا تھا۔پھر میں نے آرتی کو دلارے میاں کے بارے میں جو کچھ معلوم تھا بتایا، وہ ترکیبیں بتائیں جنہیں استعمال کر کے وہ روپوش ہونے والے لیڈروں کو چھپاتے تھے، ان کے گھروں پر اپنے کھیت کھلیان سے جنس پہنچاتے تھے، کس طرح گنے کی گاڑیوں میں حکومت کے خلاف چھاپے جانے والے پوسٹر چھپا کر شہر پہنچاتے تھے یہ بھی بتایا کہ کس طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہوں نے میرے باپ کے سامنے ایک بہت بڑے انگریز حاکم سے کہا تھا:-

"تم ہمیشہ ہی ضلع ہڈکوارٹر آ کر اور شکار کئے ہوئے ہرنوں کے کباب کھا کر اور ولایتی شرابیں پی کر چلے جاتے ہو یہاں کے مفلسوں اور ناداروں کی خوشیوں اور غموں کو تمہارے دل کب چھوئیں گے۔آخر تم کس منہ سے ان مظلوموں سے یہ توقع کرتے ہو کہ وہ راج سے وفاداری برتیں گے"

میرے باپ نے دلارے میاں کی سیاسی سوجھ بوجھ کا ایک واقعہ 'کھیر پارٹی' کے عنوان سے لکھا تھا جو غالباً سن چونتیس یا پینتیس کی ایک برسات کی رات کا تھا جب ہمارے علاقے کے ندی نالے ابل پڑے تھے اور دلارے میاں کے نیم پختہ مکان پر شہر کے کچھ بڑے سیاسی لیڈر ٹٹوؤں کی پیٹھ پر بیٹھ کر اور پورے جسم سے شرابور ہو کر پہنچے تھے اور دیر رات تک وہاں ایک میٹنگ ہوئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب ملک کی سیاست کو بڑی بے دردی سے صرف مذہب اور ذات پات کے راستے پر ہانکا جا رہا تھا اور لندن کی گول میز کانفرنس ناکام ہو چکی تھی، انہیں دنوں برطانوی وزیر اعظم رامسے میکڈانلڈ نے کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا تھا۔ برسات کی اس رات دلارے میاں کے گھر پر ان کی اکلوتی بھینس کے تین سیر دودھ اور تھوڑی سی شکر کے علاوہ کچھ نہ تھا یہ دیکھ کر کوئی کسی پڑوسی سے چاول مانگ لایا اور دلارے میاں نے اپنے مہمانوں کی ضیافت کھیر

پکا کر کی تھی۔ اس موقع پر زیر بحث کمیونل ایوارڈ کو دلارے میاں نے قبول کرنے سے سختی سے انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا تھا ——— ''ہمیں یہ ایوارڈ قبول نہیں۔ ہم ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خطرناک رویہ ایسے دو عناصر کی پرورش کرے گا جو ہمیں مضبوط پائیدار قوم بننے سے روکیں گے۔ ملازمتوں کے لئے مسلم جماعت یا ہندو جماعت کی طرف سے آئے دن جھگڑے ہوا کریں گے، پھر ایک قوم کے اندر مختلف قومیں بننا شروع ہو جائیں گی۔ لوگوں نے سوال کیا کہ پھر آپ کیا چاہتے ہیں تو ان کا جواب تھا ——— ''ہم فرقوں کا کارخانہ نہیں کھولنا چاہتے، مسلمان کو ایسے بہترین ہندو کو اور ہندو کو اقلیت کے ایسے بہترین مسلمان کو اپنا ووٹ دینے دیجئے جو سب کے فائدے کے کام کرے۔'' مجھے حیرت تھی کہ آرتی میری باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ آرتی کو دلارے میاں کے کردار کی ایک جھلک ان کی پیشین گوئی بتانے سے پہلے دکھانا ضروری تھی۔ اس لئے میں نے آرتی کو بتایا کہ میرے باپ کی روایت کے مطابق دلارے میاں اپنی پیٹھ پر کسی کی نظر نہیں پڑنے دیتے تھے۔ معاملہ یہ تھا کہ وہ کسان سبھاؤں میں کام کرنے کے لئے کبھی کبھی دور دراز کے دوروں پر نکل جایا کرتے تھے۔ ایک بار پنجاب میں قصور اور امرتسر ان حالات میں پہنچ گئے جب جنرل ڈائر جلیان والا باغ کے قتل عام کے فوراً بعد شہر میں کرفیو لگا کر بکتر بند گاڑیاں سڑکوں پر دوڑا رہا تھا اور شہر کی رنڈیوں اور فاحشاؤں کی نظروں کے سامنے اس سڑک پر شرفا کو زمین پر گھٹنوں کے بل چلوا کر پیٹھ پر کوڑے لگوا رہا تھا جس سڑک پر آزادی کے متوالے ہندوستانیوں نے ایک انگریز خاتون مس شیروڈ پر حملہ کیا تھا۔ دلارے میاں کی پیٹھ پر پڑے کوڑوں کے وہ نشان جنم داغ بن چکے تھے ——— آزادی کی تاریخ کے بارے میں ہماری نئی پود کم ہی جانتی تھی لہذا آرتی کی دلچسپی دیکھ کر میں نے اسے جنگ آزادی کے کچھ خاص خاص واقعات اور سمجھایا کہ جب بعض مسلمانوں نے عام مسلمانوں کو سرسید کے حوالے سے یہ سمجھانا شروع کیا کہ تعداد میں ہندو زیادہ ہے اس لئے اس کے ہاتھ میں ووٹوں کی طاقت بھی زیادہ ہوگی یعنی تم ایک پانسہ پھینک کر قسمت آزماؤ گے تو اس کی قسمت کا فیصلہ ایک کی جگہ چار پھینکے ہوئے پانسوں سے ہوگا، پھر بتاؤ کس کی قسمت کے چمکنے کا امکان زیادہ۔ ایسی ہی اور بھی باتیں تھیں جنہیں سن کر دلارے میاں غمگین رہنے لگے اور پھر دیکھتے دیکھتے ہی ایک ایک کر کے دلارے میاں کے سارے خواب چکنا چور ہونے لگے۔ ملک میں دو فرقوں کے درمیان نفرت اور خون خرابے سے آئے دن بگڑتے حالات کو دیکھ کر انہیں لگتا کہ انہیں اس بار عالم ضعیفی میں ماہ اپریل کی گرم سڑکوں پر گھٹنوں کے بل چلا کر پھر کوڑے مارے جا رہے ہیں۔ دلارے میاں

دل شکستہ اور مایوس انسان کی طرح رہنے لگے، انہیں چپ لگ گئی۔

ایک سال گرمی بہت پڑی، لو کی تمازت سے مویشی مرنے لگے۔ دلارے میاں بھی لو کی پلیٹ میں آگئے۔ پیاس کی شدت نے انہیں ہلکان کر دیا تھا۔ ان کی بیماری کی خبر سن کر ایک جٹا دھاری جوگی ان کے سرہانے پہنچ گئے۔ کندھے پر لٹکے جھولے سے کسی پودے کی ایک ہری پتی نکال کر دلارے میاں کو آواز دی:

"مہاراج" دلارے میاں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ جوگی نے پتی ان کی طرف بڑھائی۔

"اسے زبان پر رکھ لیں، پیاس مٹے گی کلیجہ تر ہوگا" دلارے میاں نے اشارے سے منع کر دیا۔ تو جوگی نے سمجھایا "مہاراج یہ بڑی کراماتی بوٹی ہے" دلارے میاں نے پھر آنکھیں کھولیں تو جوگی بولا "اس کے پودے کو آدی واسی کنواری کنیائیں اگاتی ہیں۔ وہ سارا دن خود پیاسی رہ کر اور منہ سے بوند بوند پانی ٹپکا کر اسے سینچتی ہیں، سادھارن طریقے سے سینچنے پر وہ پودا سوکھ جایا کرتا ہے، یہ بوٹا درلبھ ہے مشکل سے اگتا ہے۔" دلارے میاں نے تب بھی وہ پتی زبان پر نہ رکھی تو جوگی نے پوچھا:

"کیا آپ اپنی پیاس بجھانا نہیں چاہتے"

"چاہتا ہوں" انہوں نے جواب دیا۔ مگر میری پیاس ایک لمبی لڑائی کا نام ہے۔ ہر پیاس کراماتی پتی سے نہیں بجھائی جا سکتی۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔ جوگی چلا گیا تو دلارے میاں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، پاس کھڑے تیمارداروں سے تب انہوں نے وہ پیشین گوئی کی۔

"یاد رکھنا، ایک دن ہماری بستی کی بڑی باؤلی میں کنواریاں اور نو بیاہتائیں سوئیں گی اور باؤلی کا سارا پانی لوگوں کی آنکھوں کے راستے بہہ جائے گا اور باؤلی ہمیشہ کے لئے خشک ہو جائے گی۔"

پھر دلارے میاں کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ دلارے میاں کے مرنے کے کئی برس بعد جب ملک کی تقسیم میں قتل عام شروع ہوتا ایک رات انتقام کے پیاسے بلوائیوں نے ہماری بستی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ انہیں راضی کرنے کے لئے ہر گھر نے اپنا نقد زرو مال جمع کر کے چند بزرگوں کے ہاتھوں محاصرہ کئے بلوائیوں کو پہنچایا، ایک رات خاموشی سے گزری لیکن دوسرے دن بلوائیوں میں کچھ اور پتھر دل شامل ہو گئے اور ان کی نیت بدل گئی، بچاؤ کی کوئی صورت نہ پا کر بستی کی کنواریوں اور نو بیاہتاؤں نے باؤلی میں چھلانگ لگا دی، جب ان کی لاشیں نکالی گئیں تو باؤلی جس میں ایک ہاتھی پانی کا ڈبو تھا بالکل خشک ہو چکی تھی۔ پھر اس

میں کبھی پانی نہ آیا۔

پوری داستان کو آرتی نے دلچسپی سے سنا مگر جوگی کی اس پتی کی کہانی اسے عجیب لگی۔ کسی پودے کو خود سے پیاسے رہ کر قبیلے کی کنواریوں کا سینچنا اسے ایسا لگا جیسے کہانی اس پودے میں ایک طرح کا تقدس اور پاکیزگی بھی شامل کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر تو وہ چپ رہی پھر بولی۔

"پتہ نہیں آپ ہماری جنریشن کو کتنا جانتے ہیں۔ ہم خود پیاسے رہ کر دوسروں کی پیاس بجھانے کو بیوقوفی سمجھتے ہیں۔ اس کی اس بات سے مجھے دھچکا لگا، میں غور سے اسے دیکھنے لگا، اس کی تیوریاں چڑھ گئیں تھیں وہ کڑوا سا منہ بنا کر بولی:

"پھر کنوارے پن کا پاکیزگی سے بھلا کیا رشتہ ہے۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک لڑکی کنواری بھی نہ ہو اور بیاہتا بھی نہ ہو اس کے بعد بھی وہ پاک ہو سکتی ہے۔ یہ کنفیوژن پرانے لوگوں نے پھیلائے ہیں، خود میرے پتا جی بہت سی باتوں میں کنفیوزڈ ہیں۔ ماتا جی نہ روکیں تو میں ان کے ساتھ ایک دن بھی رہنا پسند نہ کروں، ان سے کئی بار کہہ چکی ہوں تم اپنے Contradictions کے ساتھ زندہ ہی تو ہو، مرے نہیں جا رہے ہو، یہ دنیا بھی ابھی مری نہیں جا رہی ہے، ابھی بہت دنوں اسی طرح چلے گی تو مجھے بھی میرے اپنے Contradictions کے ساتھ جینے دو اس میں کون سی پرلے ہوئی جا رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ میرا باپ جان کر انجان بن رہا ہے۔ گزرے دنوں کے مرگھٹ پر ویسی ہی کوٹھی بنانا چاہتا ہے جیسی پہلے کبھی بنی تھی۔ اسے بتانا پڑے گا کہ ہم سارے انسان گھونگے کی طرح ہیں، ہمارا خول بدلے گا تو ہمارا وجود بھی بدلے گا۔ ابھی دیکھئے گا میرے اس سے بہت جھگڑے ہوں گے حالانکہ ہم لوگوں کی Stratigy اپنے ماں باپوں سے اس وقت تک Confruntation ٹالنے کی رہا کرتی ہے جب تک ہمارا مطلب نکل رہا ہوتا ہے۔

یہ کہہ کر آرتی مجھے خیالات کے ایک عجیب سے دھند لکے میں ہاتھ پیر مارتا چھوڑ کر چلی گئی۔

اب میری صحت کچھ بگڑنے لگی تھی، بڑھاپا رنگ لا رہا تھا، پیشاب کی بیماری نے تہمد بندھوا دی تھی۔ میں اپنے پرانے وید سے دوا لینے گیا۔ واپسی پر جب میری موٹر اس مقام سے گزری جہاں دلارے میاں کی قبر پڑتی تھی تو میں نے موٹر رکوائی، چھڑی ٹیکتا قبر پر پہنچا، مدتوں سے ادھر نہ آیا تھا، پکی قبر کی حالت خستہ ہو چکی تھی، چبوترہ جگہ جگہ سے کھل گیا تھا، کہیں کہیں گہرے گڑھے ہو گئے تھے۔ لگتا تھا عرصے سے دلارے میاں کا اپنا پرایہ وہاں جھانکا بھی نہیں تھا، برسوں پہلے کچھ لوگوں نے چار پائپ کھڑے کر کے قبر کے تعویذ پر معمولی ٹین کی چادر کا سائبان ڈلوا دیا تھا جو بیحد زنگ آلود اور خستہ ہو چکا تھا، قبر کا سرہانہ دھنس چکا تھا۔ ادھر ادھر اونچی گھانس

اگ آئی تھی جس پر جانوروں نے لید کی ہوئی تھی۔ اسی وقت قبر پر اگی ہوئی گھانس پر ایک جگہ میری نظر ٹھہر گئی، اس گھانس میں اگے ایک پودے کی پتیوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا، میں نے بڑھ کر انہیں غور سے دیکھا تو میرا تجسس اور بڑھا اور میں نے اس کی دو پتیاں توڑ لیں اور گھر لے آیا۔ میرے باپ کے روزنامچے میں جوگی والے واقعے کے ساتھ پیاس بجھانے والی اس پتی کی ڈرائنگ صاف صاف بنی ہوئی تھی جس پر زبان کے کانٹوں کی طرح باریک اور ملائم سے کانٹے بنے ہوئے تھے۔ اس ڈرائنگ اور قبر سے توڑی پتی میں مجھے حیرت انگیز مماثلت محسوس ہوئی تو میں بے چین ہو گیا، یہ تو وہ پتی تھی جسے دلارے میاں نے پیاس بجھانے کے لئے زبان پر رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آرتی کے باپ نے کچھ دنوں پہلے جنگلی جڑی بوٹیوں کا کچھ تجارتی کام بھی ولایت میں مقیم اپنے کسی دوست کے ساتھ شروع کیا تھا، سوچا آرتی کے باپ کو فون کر کے بلاؤں اور پتی دکھاؤں، ممکن تھا کہ وہ اس بوٹی کی صحیح شناخت کر لیتا۔ میری الجھن یہ تھی کہ جس پودے کو خاص طریقے سے بوند بوند سینچا جاتا ہو اور وہ بھی خود پیاسے رہ کر، آخر وہ ایک قبر پر بے آب نمو کیسے پا گیا۔ مجھے شک ہوا کہ یا تو وہ پتی وہ نہیں جو کہ میں سمجھ رہا تھا یا پھر اس پودے کے خاص طریقے سے سینچے جانے کی وہ روایت ہی غلط تھی۔

ابھی میں رگھوبر دیال کو اپنے گھر بلا کر دلارے میاں کی قبر سے توڑی گئی وہ پتی دکھانے کے لئے فون کرنے کو سوچ ہی رہا تھا کہ وہ آ گیا۔ لیکن اس بار وہ آرتی کے ساتھ نہیں اکیلا آیا تھا، میں نے محسوس کیا کہ وہ غیض و غضب کی حالت میں تھا اور شاید ناگیشور ناتھ مندر سے سیدھا چلا آ رہا تھا کیوں کہ ماتھے پر لگے تلک میں تازگی تھی، اس نے آتے ہی بڑے چتاؤ اور رسمی طور پر میرے پاؤں چھوئے پھر کسی تمہید کے بغیر طبیعت پر جبر کر کے لہجے میں نرمی لا کر بولا:

''یہ تو پتہ نہیں کہ آپ اپنے دل میں میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور آپ کے دل میں میری کتنی عزت ہے، سب تو مجھے لچا لفنگا نیتا سمجھتے ہیں۔ سب یہی سوچتے ہیں کہ راج نیت میں آنے کے بعد سے میری پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہے۔ آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ آج تھانیدار بھی اوپر اوپر سے دکھانے کے لئے میرا رعب کھاتے ہیں، چاہے دل میں مجھے کچا چبانا چاہتے ہوں، اب آپ یہ بھی جان لیجئے کہ اسی رگھوبر دیال کو کبھی دو کوڑی کے سڑک چھاپ بدمعاشوں نے کالر پکڑ کر چپلوں سے مارا تھا، پھر یہ لاٹری کیسے نکل آئی۔ تو یہ لاٹری یونہی نہیں کھل گئی ہے۔ پارٹی کا ٹکٹ پانے کے لئے میں نے اپنے سینئر نیتاؤں اور لیڈروں کے لئے کیسے کیسے پاپ بھرے کام کئے ہیں آپ سنیں گے تو تھوکیں گے مجھ پر۔ یہ آن بان، موٹر گاڑی،

یہ اوپر اٹھی مونچھیں، یہ سو روپے روز کی منہ لال رکھنے والی گلوریاں میری طرح کوئی مائی کا لعل ان کی قیمت چکا کر دیکھے حلق میں نہ آ جائے تو کہنا۔ دیکھو بابو جی ہمارے حصے کی راج نیت میں دو دن جینا مشکل ہے ذرا نظر ہٹی کہ ننگے ہوئے۔ بدن سے کپڑے کہاں گئے، کس نے اتارے کچھ پتہ نہیں چلتا پھر اس ننگے کو منہ چھپانے کی جگہ نہیں ملتی۔ پر ہماری مانیتا یہ ہے کہ جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم، اس لئے ہم کو سیکھنا پڑا کہ کپڑے پہن کر ننگا کیسے رہا جاتا ہے۔'' میں نے دیکھا کہ وہ اپنا غصہ نکالنے کے لئے بولے چلا جا رہا تھا لیکن بات دراصل کچھ اور تھی اور زیادہ سنجیدہ تھی کیوں کہ اس نے ایک نیا قصہ چھیڑ دیا جو اس کے غصے کا اصل سبب نکلا، پہلے تو وہ مجھے کچھ دیر گھورتا رہا جیسے نظروں سے تول رہا ہو پھر بولا ''اسے سمجھایئے — آرتی کو — شاید آپ کی بات مان لے۔ دسواں پاس کرانے کے بعد جب میں اس کی پڑھائی بند کر رہا تھا تو آپ ہی تو تھے جس نے مجھے بتایا تھا کہ اپنے زمانے کے دھرندر کانگریسی سید محمود اپنی بیٹی کو پڑھانا نہیں چاہتے تھے اور پردہ بھی کرانا چاہتے تھے تو لال نہرو نے انہیں ڈانٹ بتائی تھی اور کہا تھا کہ تمہاری کہنی اور کرنی میں اتنا انتر ہو گیا یہ میں سپنے میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ مجھے وہ بات یاد رہی، سوچا ٹھیک ہے آرتی کو پڑھاؤں گا — پڑھایا — اس نے کہا لو، اور پڑھاؤ! جانتے ہیں آپ، اب وہ ایک خان زادے سے بیاہ رچانا چاہتی ہے، آج کی دھار مک راج نیت میں میرا تو انڈرویر تک اتار لے گی وہ — اسے سمجھایئے، بتایئے کہ میرا ریوالور بدیسی کمپنی کا ہے، اتنے پاس سے فائر کروں گا کہ زخم کے چاروں طرف گہری بارود جم جائے، چھوڑوں گا نہیں دونوں کو۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے لال پیلے دیدے گھماتا ہوا اور پھنکاری بھرتا ہوا چلا گیا۔ ایسی صورت میں مجھے اسے وہ پتی دکھانے کا موقع ہی نہ ملا جس کے لئے میں اسے فون کر کے بلانے والا تھا۔

آرتی کے باپ کے چلے جانے کے بعد مجھے یاد آیا کہ شروع کی ملاقاتوں میں آرتی نے سب سے پہلے مجھ سے خان زادوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی دلچسپی دکھائی تھی جن کا ہماری بستی میں اب تو پورا ایک محلہ آباد تھا۔ میں نے آرتی کو بتایا تھا کہ ہماری بستی میں آباد سارے خان زادے نو مسلم ہیں، ان کے بزرگ سن اٹھارہ سو کے قریب مسلمان ہوئے تھے۔ یہ لوگ اصل النسل راجپوت تھے۔ ان میں کوئی کنور بندے علی کوئی کنور شرافت حسین کے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ان کے بزرگوں کی شیروانیاں دائیں طرف سے کھلتی تھیں اور عام مسلمانوں کے گھروں کے بنے ہوئے شامی کبابوں سے اس لئے پرہیز کرتے تھے کہ کہیں گائے بھینس کے گوشت کے نہ ہوں۔ یہ اپنے باورچی خانے کو چوکا کہتے اور کھانا

پہلے چوکے کو لیپ پوت کر پکاتے اور پیتل کے برتن استعمال کرتے۔ انہوں نے انیسویں صدی کی مردم شماری میں خود کو مسلمان صوفیوں کی پرستش کرنے والا بھی لکھوایا تھا اور بستی کے ایک پرانے ولی اللہ کے مزار پر یہ سر جھکانے بھی آتے تھے۔ انکے۔ م کی ایک تاریخی سرائے آج بھی موجود ہے جسکے طاق اور دیواریں غدر میں باغی سپاہیوں نے کہیں کہیں سے اس شک میں کھود ڈالیں تھیں کہ شاید ان میں دولت چھپی مل جائے۔ اب اس میں ان کی لڑکیوں کا مدرسہ ہے۔

میں قبر پر سے توڑی گئی پتی کے سبب پہلے خاصی الجھن میں تھا کہ رگھو بردیال نے آرتی کے حوالے سے میرے سامنے ایک اور الجھن کھڑی کر دی تھی۔ آخر کو آرتی سے بات کرنے کیلئے میں نے اسے فون کر کے گھر بلایا۔ میرے سامنے آتے ہی وہ وہ جس طرح مجھ سے مخاطب ہوئی اس نے میرے ہوش ہی اڑا دئے۔ وہ آتے ہی بولی ــــ ''مجھے معلوم ہے میرے باپ نے آپ سے کیا کہا ہوگا۔ وہ لوک لاج کے ڈر سے مجھے خان زادوں میں شادی کرنے سے نہیں روک رہا ہے اور نہ بیٹی کی محبت میں ایسا کر رہا ہے۔ اب سیاست اصولوں پر تو چلتی نہیں، پرانی پارٹی چھوڑ کر جس نئی پارٹی میں اسے زیادہ دودھ ملائی دکھائی دے رہی ہے اس میں گھسنے میں میرا مسلمان لڑکے سے شادی کرنا اس کا پالیٹکل کیریئر بگاڑ سکتا ہے۔ مجھے ولایت جا کر اپنا کیریئر بنانے کے لئے اپنے باپ کا کوآپریشن چاہئے اس لئے میں نے ابھی کچھ دیر پہلے اپنے باپ سے جھوٹ بولا ہے کہ میں نے خان زادوں کے لڑکے سے شادی کرنے کا خیال ترک کر دیا ہے۔ میں ولایت جا رہی ہوں، میرے پیچھے کچھ دنوں بعد وہ لڑکا بھی وہاں آجائے گا، پھر شاید بہت جلدی ہم بھارت نہیں آئیں گے۔ ہم دونوں کو معلوم ہے کہ ہماری پیاس کیا ہے اور ہمیں اسے رام بھروسے نہ چھوڑ کر خود بجھانا ہے۔ میں آپ پر بھروسہ کر کے آپ سے سچ بول رہی ہوں اس سچ کو اپنے تک رکھئے گا کیوں کہ ملک سے دور دیشوں میں اس کی بیٹی کیا کر رہی ہے یہ سوچ کر اسے اپنے کارتوس نہیں خراب کرنا پڑیں گے۔'' یہ سن کر کچھ دیر میں چپ رہا اور اپنے کو سنبھالا، پھر آرتی سے پوچھا:

''تمہارا باپ کچھ سال پہلے جڑی بوٹیوں کی تجارت کرتا تھا''

''جی ہاں۔'' وہ بولی۔

''کیا تمہیں کسی ایسے پودے کا پتہ ہے جس کی پتیاں پیاس بجھانے کے کام آتی ہوں اور جسے خود پیاسے رہ کر بوند بوند سینچا جاتا ہو۔''

وہ یہ سن کر ہنسی اور بولی ''میرا باپ خود پیاسے رہنے والا دھندا نہیں کرتا لیکن وہ پیاس

بجھانے کی دوا بنانے والی ایک بوٹی کیاریوں میں ضرور اگاتا تھا۔"

"وہ پودا کس طرح سینچا جاتا تھا کہتے ہیں بوند بوند پانی سے سینچتے ہیں۔"

"کیاریوں کے اوپر باریک چھید والے لوہے کے پائپ باندھے جاتے تھے ان سے پانی ٹپکایا جاتا تھا۔" یہ کہہ کر وہ پھر ہنسی 'بیچارے لوہے کے پائپ سارا پانی ٹپکا کر خود ضرور پیاسے رہ جاتے ہوں گے۔

میں نے آرتی سے یوں ہی پوچھ لیا۔

"تمہارے باپ نے جڑی بوٹیوں کی تجارت کیوں بند کر دی۔"

"وہ جو فائدہ چاہ رہے تھے اس کی پیاس نہیں بجھی۔" آرتی نے جواب دیا اور واپس جانے کے لئے اٹھی، دروازے پر پہنچ کر پلٹی، مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے آخری بار مل رہی ہے، پھر جھک کر نمستے کیا اور چلی گئی، اس کے چہرے پر کسی دکھ کی پرچھائیں نہ تھی۔

رگھو بردیال کی خوبصورت بیٹی اپنے منصوبے کے مطابق ولایت جا چکی ہے۔ جو بھی اب جاتا ہے واپس نہیں آتا، سوچتا ہوں میری بستی نے کیسے کیسے نامی گرامی لوگ پیدا کیے۔ اس چھوٹی سی جگہ سے نکل کر کیسی بڑی بڑی خدمتیں انجام دی ہیں، وہ دنیا گھومے مگر مرنا یا دفن ہونا اپنی سرزمین اور اپنے گھر پر ہی چاہا۔ ان کی وصیتوں کے مطابق دور دور سے ان کے جنازے دفن ہونے یہاں آیا کرتے تھے، اب سب یہاں اپنی سہولت سے اپنا برا وقت کاٹنے کے لئے عارضی طور پر رہنا تو چاہتے ہیں لیکن اس معمولی سے قصبے میں مرنا یا دفن ہونا نہیں چاہتے۔ ممکن ہے کبھی اپنے بچوں کو لے کر ایک آدھ دن کے لئے اپنے پرکھوں کے گاؤں گراؤں دکھانے کسی جیپ سے کسی دن آرتی بھی آئے اور شام ہونے سے پہلے واپس چلی جائے۔ مجھے یقین ہے ایسا کرتے ہوئے اس کی آنکھیں نہیں بھیگیں گی۔ میری بہوئیں بہت دنوں سے یہاں نہیں رہنا چاہتیں۔ ان کے شوہروں کے کاروبار شہر میں پھیل گئے ہیں۔ بیٹے چپکے چپکے وہاں زمین دیکھ رہے ہیں۔ ایک دن رگھو بردیال انہیں وہاں کوئی زمین دکھانے کے لئے لے جانے آیا تھا تو میں نے اس کو دلارے میاں کی قبر سے توڑی ہوئی پتی دکھا کر اس کے بارے میں تصدیق کرنا چاہی۔ اس نے بتایا کہ وہ پودا بہت پیاسی مٹی سے اگتا ہے اور پیاس بجھانے کی اکسیر دوا ہے۔ اس نے حیرت سے پوچھا کہ اس نایاب پودے کی پتی مجھے کہاں سے ملی، میں کیا جواب دیتا، کچھ نہ بولا۔

میرا اب لکڑی ٹیک کر چلنا بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے، وید سے دوا لینے جانا بھی اب پہاڑ

چڑھنا جیسا لگتا ہے۔

لڑکوں کے تیور بتاتے ہیں کہ اب کبھی بھی میرا بوریا بستر یہاں سے بندھ سکتا ہے اس لئے ایک بار پھر دلارے میاں کی اجڑی ہوئی قبر کے درشن کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جب میں دلارے میاں کی قبر سے توڑی ان پتوں پر نظر ڈالتا ہوں تو ایک عجیب سی حیرت کے عالم میں کھو جاتا ہوں۔ پھر ان سوکھی پتیوں سے سوال کرتا ہوں:

"دلارے میاں، تم کوئی ولی اللہ تو تھے نہیں، سیدھے سادے انسان تھے، پھر تمہاری قبر پر اگنے والے اس پودے کی آبیاری کس نے کی جو دوسروں کی پیاس بجھاتا تھا۔ یہ کرامات کیسے ہوئی؟ پھر میرا دل بھاری ہو جاتا ہے، آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، بھاری دل سے آواز آتی ہے۔

"یہ پتیاں دلاور میاں کی قبر پر رکھ آؤ اور کہو، میاں جی نہ پیاس ایک سی رہتی ہے اور نہ پیاس بجھانے کے طریقے۔ جن منوں مٹی کے نیچے دفن ہو، لو یہ کرامات بھی ہمیشہ کے لئے اسی میں دفن کردو۔۔۔" مگر افسوس کہ دل کی بات دل ہی میں رہ گئی۔

چند ماہ کی مدت کے بعد میرے بیٹوں نے شہر بسالیا اور مجھے جیتے جی بزرگوں کی چوکھٹ اس وقت چھوڑنا پڑی جب میرے پاؤں قبر میں لٹکے تھے۔ کیا کہوں کہ اس وقت دل پر کیا گزری جب ہماری سواری مع ساز و سامان کے اس راستے سے گزری جدھر دلارے میاں کی قبر تھی لیکن نہ وہاں زنگ آلودہ ٹین ٹپر کے سائبان کا کوئی نشان تھا اور نہ کسی قبر کا۔۔۔ دور تک تاروں کی ایک چہار دیواری کھینچی ہوئی تھی جس کے میدان کو بلڈوزروں نے برابر کر دیا تھا۔ کسی نے بتایا وہاں ہوائی اڈے کے لئے پٹرول کا ڈپو تعمیر ہو رہا تھا۔

○○

کامدانی فراک

ریاض قاصدار

دھنی رام کو اس کا بھی پتہ نہ تھا کہ اس کی کہاں کہاں اور کتنی اراضیات تھیں۔ البتہ زرعی پیداوار اور خرچ کی حدیں چونکہ ہر سال اس کے کھاتوں میں رقومات کے اندراجات ہوا کرتے تھے اس لئے صرف اتنا جانتا تھا کہ اس کی کچھ اراضیات بھی تھیں۔ زراعت سے بے اعتنائی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے نزدیک ہر نئے دن لکشمی کے دیدار کا مزہ کچھ اور ہی تھا۔ اور یہ اسی وقت جب کہ گذشتہ ہفتہ ایک دلچسپ واقعہ رونما ہوا، اسے معلوم ہوا کہ موضع آزادنگر میں اس کا ایک باغ تھا، جہاں رگھو نامی مزارع کام کرتا تھا۔ ہوا یہ کہ اس باغ میں اس سال آئی ہوئی سپوٹوں کی فصل کا چرچا جب اطراف میں ہونے لگا تو ٹی وی والوں نے دھنی رام کا انٹرویو لیا تھا۔ جب ایسی حیرت انگیز فصل آنے کا راز پوچھا گیا تو دھنی رام نے اپنی طرف منسوب کر کے ایسے ایسے فرضی کارنامے بیان کئے کہ واقف کار ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے تھے۔ دھنی رام کی بڑبولی سے رگھو کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو صرف اپنے کارنامے کے عوض میں اپنے مالک سے انعام پانے کے لئے بے چین تھا۔ اس لئے دھنی رام کو فصل بتلانے کے لئے بلوایا تھا۔ ویسے بھی ٹی وی انٹرویو کے بعد خود دھنی رام کے دل میں فصل دیکھنے کی خواہش کروٹیں لینے لگی تھی۔ آخر کار دیگر مصروفیات کو موخر کر کے ایک آدھ گھنٹہ یہاں گزار کر واپس جانے کے ارادہ سے دھنی رام کل صبح ہی اپنے فارم ہاؤس آیا تھا۔ لیکن جب باغ میں قدم رکھا تو اسے لگا جیسے سپوٹوں کی منڈی میں آگیا ہو۔ ایک ایک درخت کو حیرت سے تکتا رہا۔ پھلوں کے بوجھ سے

جھکی ہوئی ڈالیاں یوں لگ رہی تھیں جیسے زمین کو چومنے کی برسوں پرانی چاہ پوری کرنے جا رہی ہوں۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ درختوں پر صرف پھل تھے یا کچھ پتے بھی تھے۔ فرطِ مسرت سے اس نے آواز دی۔ "رگھو...... رگھو"

دوڑا دوڑا آ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے اس نے دہقانی لہجہ میں پوچھا: "کام ہے کیا مالک؟"

مسکرا کر دھنی رام نے رگھو کے سراپا کو دیکھا اور رگھو کے دل میں خوشگوار سا چھنا کا ہوا۔ رگھو آس کی جھیلوں میں غوطے لگاتا رہا، ادھر دھنی رام کا تاجرانہ ذہن حساب کتاب کی میزان سجاتا رہا۔ پھر تفہیمی انداز میں انگلی سے کنپٹی بجا کر بولا۔ "فصل اچھی ہے نا؟"

"بہوت اچھی مالک۔" رگھو سادگی سے بولا۔ "پانچ سال کا حساب پورا ہوا۔

"مطلب یہ کہ میرا پیسہ بیکار نہیں گیا۔" فخریہ لہجہ میں دھنی رام نے کہا۔

مالک کی ظاہری خوشی کو دیکھ کر رگھو مفلسانہ سوچ کی رو میں بہتا گیا۔ فصل آئی تھی ہی ایسی۔ اسے یاد آیا کہ رام دین کاکا نے بھی اپنے باغ کی پرداخت اپنے بچے کی طرح کرنے کے باوجود خاطر خواہ فصل نہ پا کر رگھو کی مہارت کو دیکھ کر اسے اپنا استاد مانا تھا۔ اب مالک کو بھی مطمئن دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ موجودہ فصل اس کی کڑی محنت کا نتیجہ تھی۔ باتوں باتوں میں بے خیالی میں دھنی رام کا ہاتھ کبھی جیب کی طرف جاتا تو رگھو کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی کہ اب ہاتھ جیب میں گیا اور اب روپے تھامے اس کی طرف بڑھا۔ ویسے اس نے سن رکھا تھا کہ دھنی رام بخیلی میں یکتائے روزگار تھا، لیکن اس کے خیال میں اب یہ سب جھوٹ ثابت ہونے کو تھا۔ مالک جب خوش ہو تو ممکن ہی نہیں کہ انعام دیئے بغیر واپس چلا جائے۔ پھر اس کی بے کل آنکھوں میں اس کی چھوٹی بیٹی منی کی مسکراتی شکل گھوم گئی۔ کئی ماہ بعد آج اس نے منی کی مسکراتی شکل دیکھی تھی۔ اسے یاد آیا کہ پار سال دسہرہ کے تہوار میں پڑوس والی ساوتری کی بیٹی گڈی کا مدانی فراک پہن کر گلی میں اتراتی نکلی تھی تو منی نے رو رو کر ویسا ہی فراک لا دینے کے لئے ضد کی تھی۔ لاکھ بہلانے کے باوجود کہ اگلے دسہرہ پر اسے اس سے بھی اچھا فراک لا دیا جائے گا، منی اپنی ضد پر اڑی رہی تو دو چار طمانچے مار کر رگھو نے اس پر اپنی مفلسی کا غصہ اتارا تھا۔ اس دن سے منی اس سے سہمی سی رہا کرتی تھی۔ اب جو منی کی مسکراتی شکل نظر آئی تو رگھو نے اس کا یہ شگون لیا کہ اب جو بھی ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ انعام ضرور ملے گا۔ ایک فراک خریدنے کے بقدر تو ضرور ملے گا۔ باوجود یہ کہ انعام کا ابھی کوسوں دور تک پتہ نہ تھا، رگھو ابھی سے ڈھیر سارے منصوبے بنانے لگا۔ پچھلے اتوار کو بازار کے فٹ پاتھ پر لگے اسٹال میں منی کے سائز والا کامدانی فراک ہی خرید لے

گا۔ گھر پہنچنے تک اگر وہ سو بھی جائے تو فراک کو پھیلا کر اس کے سرہانے رکھے گا۔ صبح بیدار ہو کر اچانک فراک دیکھ کر منی کتنا خوش ہوگی۔ اس خیال سے ہی اس کے دل میں کلبلانے والی میٹھی میٹھی گدگدیاں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بن کر رینگ گئیں۔ دھنی رام نے ہنس کر پوچھا:

''ایسی کون سی بات یاد آگئی جو مسکرائے جا رہا ہے۔''

رگھو منمنایا۔ ''وہ، وہ پھسل ہے نا مالک......''

نکیلے لہجے میں دھنی رام نے رگھو کے الفاظ دہرائے۔ ''پچھلے پانچ سال کا حساب برابر کر دیا۔ یہی نا؟''

''برو بر مالک''۔ رگھو خوشدلی سے بولا۔ پھر دل میں سوچا کہ ان ساہوکاروں کو گھڑی میں تولہ اور گھڑی میں ماشہ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ مالک جب خوش ہوتا ہے تو وہی موقع مطلب پر آنے کے لئے موزوں ہوتا ہے۔ ویسے بھی لوہے کو اسی وقت پیٹا جائے جب وہ گرم ہو۔ کان کھجلاتے ہوئے نیچی نظر کئے وہ بولا۔ ''مالک اس کا انعام جرور دیں گے۔

بلی بالآخر تھیلے سے باہر آئی بھی تو ایسے ساہوکار کے سامنے جس کو دان و دہش سے کترانا ورثہ میں ملا تھا۔ وہ خود تاکیداً کہا کرتا تھا کہ کنگال بننے کا شوق چرائے تو رحم دل بن جاؤ۔ دھنی رام یوں بھی اپنے خاندانی روایات کا سچا رکھوالا تھا۔ تب ہی تو اس کی پشتینی دولت برسہا برس سے شرمیلی دلہن کی طرح اس کی تجوریوں کی زینت بنی چلی آ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر حشیانہ سی مسکراہٹ رینگ گئی اور استہزائیہ انداز میں سر کو جنبش دے کر وہ آگے بڑھ گیا۔ پھر ایک خوبصورت بہانے کے لئے تمہید باندھی۔ ''سامنے والی فصل تو دیکھ لی۔ اندر کا کیا حال ہے؟''

''بہوت بڑھیا مالک''۔ رگھو نے پر جوش انداز میں کہا۔

دھنی رام نے درشت لہجہ میں کہا ''دیکھے بنا ہی یقین کر لوں؟''

دھنی رام کا کھردرا لہجہ رگھو کے مخلصانہ دل پر شدید چوٹ سے کم نہ تھا۔ کہاں تو اب تک انعام پانے کی چاہ میں اس نے خیالی محل سجائے تھے اور کہاں اب دھنی رام انہیں مسمار کرنے پر تلا ہے۔ اس نے امید و بیم کے ساتھ کہا:

''میں نہیں سمجھا مالک۔''

سمجھاتا ہوں۔'' باغ کے کنارے پر ایک درخت کی طرف ہاتھ کے اشارے سے بتا کر رگھو کی آنکھوں میں تمسخرانہ انداز میں جھانکتے ہوئے دھنی رام نے پوچھا: ''اس درخت پر صرف پتے ہیں۔ ہیں نا؟''

''جھاڑ پر پتے ہوئیں گے نا مالک۔'' رگھو ہنسا۔

''بہت خوب۔'' دھنی رام چہکا۔ ''تو نے مان لیا کہ صرف پتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔''

''برو بر پتے ہیں مالک۔''

''تو پھر پھل کہاں گئے؟'' دھنی رام نے شدید حملہ کیا۔

''کھانے والے کھائے ہوئیں گے۔'' رگھو سنبھل کر بولا۔

''کھائے ہوں گے؟ کون؟'' دھنی رام بگڑ گیا۔

''وہ ہوتے ہیں نا مالک کوئل، مینا اور بھی......''

''اڑایا کیوں نہیں۔'' دھنی رام دہاڑا۔ ''بجو کے کھیلنے کے لئے رکھے ہیں کیا؟''

''بجو کے؟ ہاہاہا......'' بے ساختہ کھلکھلایا۔

''اتنی ہمت؟ میرا مذاق اڑاتا ہے؟'' دھنی رام ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''کھال کھینچ کر بھس بھروادوں گا۔''

دھنی رام کے غصہ کا اثر نہ لیتے ہوئے رگھو نے خون کھولانے والی تشریح کی۔ ''وہ۔ وہ بجو کے، ہی ہی۔ یہ جنادر بھی اب کا پریسن کا مطلب سمجھ گئے مالک۔ ہی ہی۔ کوئل بجو کے کے سر پر ٹھونگ مارتی ہیں چڑیاں پھل کھاتی ہیں۔ چڑیاں اس کا سرٹ نوچتی ہیں، مینا پھل لے کر اڑ جاتی ہیں۔ ان کو مالوم پڑ گیا ہے یہ بجو کے کچھ نہیں کرتے مالک ہی ہی ہی۔ پر وہ پھل کھا کر بھی پھل چھوڑ جاتے ہیں مالک۔ پھل ہیں۔''

''بکتا ہے تو۔'' دھنی رام پھنکارا۔

''جھوٹ!''

''پھل کہاں ہیں؟''

''من کی آنکھ سے دیکھو۔''

اچھی فصل کو خراب ثابت کرنا اسے ناممکن سا لگا۔ ایک نوکر سے ہار ماننے کی ذلت کو بھلا وہ کیسے سہہ پاتا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اب پینترا بدلنا چاہئے ورنہ رگھو کے انعام کا جواز مضبوط ہوگا۔ اس نے کھلی دھمکی دی۔ ''سچ سچ بتا پھل کہاں چھپا رکھے ہیں ورنہ......''

رگھو کا چہرہ ایکدم سے نچڑ گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے دھنی رام نہیں بلکہ کوئی سنگ دل مفتش یکے بعد دیگرے اس کے حواس چھنتا جا رہا ہو۔ شدہ شدہ سوچ کی آزردہ لہروں پر بہتے بہتے وہ دھنی رام سے مخاطب ہوتا گیا۔ میری ایمانداری کو گالی دے کر تم نے ٹھیک نہیں کیا۔ تم کیا

جانو فصل وہی اچھی ہوتی ہے جوان دیکھے بٹوارے سے بچ کر ہاتھ آتی ہے۔ انسان چیز ہی کیا ہے۔ شیطان کو بھی اگر رکھوالی پر لگادو تو اپنی چوک پر وہ اپنے ہی بال نوچ کر رہ جاتا ہے جب اسے پتہ چلتا ہے کہ اسے کوئی نہیں روک سکتا، جسے سب کو کھلانے والا نظروں کے سامنے کھلا دیتا ہے۔ اچھے برے کی قدر تم کیا جانو۔ تم کنگال ہو۔ ایسے کنگال جس کے پاس سوالی کی جھولی میں ڈالنے کے لئے دو میٹھے بول بھی نہیں ہیں۔ پھر اپنی بیٹی کی شبیہ سے مخاطب ہوا۔ میں بھی کتنا نادان تھا کہ ایک کنگال کو فیاض سمجھ بیٹھا۔ تم مایوس مت ہونا بیٹی، فراک ضرور لاؤں گا۔ ہاں وہی کامدانی فراک جسے پہن کر تو راج کماری کی طرح اترائے گی۔ جب وہ دیئے کی روشنی میں جھلملائے گا تو اس کی کرنوں سے کھیلتی تو کتنی اچھی لگے گی۔ فراک لاؤں گا، ضرور لاؤں گا۔

اس بیچ دھنی رام کے کھنکارنے کی آواز نے اس کے خیالات کے تانے بانے بکھیر دیئے۔ تصوراتی دنیا میں دھنی رام کو جتنا کچھ کہنا تھا کہنے کے بعد اسے اپنے دل کا بوجھ قدرے ہلکا محسوس ہوا۔ ایک شان بے نیازی سے بولا۔ پھل میں نے نہیں لے، پھل ہیں، پھل ہیں۔ رگھو کے الفاظ کو دھنی رام نے اپنے گالوں پر چانٹوں کی طرح محسوس کئے۔ وہ مخمصے میں پڑ گیا کہ اب کیا کیا جائے۔ ایک اندھا بھی چھو کر کہہ سکتا ہے درخت پر پھل نہیں ہیں، اور یہ ہے کہ ایک سانس میں کہتا ہے پھل ہیں، پھر دوسری سانس میں کہتا ہے کہ پھل نہیں ہیں۔ کوئی بھید ہے ضرور جس کا پتہ کرنا چاہئے۔ سوچتے سوچتے وہ توہمات کی دھند میں بھٹکتا گیا۔ دادی ماں کی کہانیوں میں اس نے سن رکھا تھا کہ سنسان مقامات پر بھوت پریت بسیرا کرتے ہیں اور وہاں پر بھٹک کر آنے والے کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے ہیں۔ کہیں یہ بھی بھوتوں کی کارستانی نہ ہو کہ جہاں میں ٹھہرا ہوں وہاں سے پتے اور جہاں رگھو ٹھہرا ہے وہاں سے پھل نظر آرہے ہوں۔ شاید ایسا ہی کچھ ہے۔ اب آزمانے میں مضائقہ ہی کیا ہے۔ آخر ہمت جٹاتے ہوئے قریب جا کر اس نے درخت کو چھوا۔ پتے ہی تھے۔ پھر رگھو جہاں ٹھہرا تھا وہاں آکر دیکھا۔ پتے ہی نظر آئے۔ جب پوری بات آئینے کی طرح صاف ہوئی اسے اپنے آپ پر غصہ آیا کہ ایک گنوار کی باتوں میں آکر اس نے یہ تماشہ بھی کیا۔ اسے اس شرارت کا مزہ چکھانا چاہئے۔ چنانچہ انعام کو ٹالنے کے لئے رچے گئے کھڑاگ کو ذہن سے جھٹک کر اس نے قسم کھائی کہ رگھو کی زبان سے حقیقت اگلوا کر ہی رہے گا۔ حلق کے بل چیخا۔ "مان لے کہ پھل نہیں ہے"

"نہیں مانوں گا۔"

"اف، تیری یہ ہمت۔ زبان لڑاتا ہے۔" مارنے کے ارادہ سے دھنی رام نے رگھو پر

ہاتھ بھی اٹھایا۔

یہ ساری کارروائی رگھو کے دل پر ایک زبردست دھکے سے کم نہ تھی۔اب تو انعام پانے کی رہی سہی امید بھی جاتی رہی۔اس نے کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹ صرف کپکپا کر رہ گئے۔ ماحول نظر فریب منظر بنتا گیا۔اب جھاڑ تھے، پتے نہ پھل۔ایک چٹیل میدان پر دھوپ کی حکمرانی ہے۔ گرم ہوا کے جھکڑوں پر منی کا فراک ڈولتا جا رہا ہے۔کبھی سورج کی شعاعوں سے چمکتا ہے اور کبھی دھول میں چھپ جاتا ہے۔منی اسے پکڑے دونوں ہاتھ اٹھائے دیوانہ وار دوڑ رہی ہے۔ فراک دھیرے دھیرے ہوا میں بلند ہو رہا ہے، بلند اور بلند۔ پھر آسمان کی بے کراں وسعتوں میں معدوم ہوتا ہے۔ پسینے میں شرابور دھول سے اٹے ہوئے چہرہ کو ہاتھ کی پشت سے پونچھتے ہوئے منی مرے مرے قدموں سے واپس آ رہی ہے۔ پلٹ پلٹ کر آسمان کی طرف دیکھے جا رہی ہے۔شاید فراک کی تلاش میں۔رگھو گھٹی گھٹی آواز میں چلا رہا ہے۔مجھے معاف کرنا بیٹی۔ تیرا دھوکہ باز باپ شرمندہ ہے۔منی، منی، منی۔

رگھو کی خاموشی سے جھلا کر دھنی رام گرجا۔"گونگا ہو گیا کیا؟ بتا پھل کہاں ہیں؟"

رگھو جیسے اچانک نیند سے جاگا ہو، بڑبڑایا۔"ہاں آں وہ وہ رہے۔پھر کسی جٹا دھاری سادھو کی طرح آسمان کی طرف ہاتھ آنکھیں موند کر بدبدایا۔نظر نہیں آتے، پر ہیں، وہ رہے۔ پھل ہیں۔پن ہے۔پن ہے۔وہ نٹ کھٹ بالک پھل لے کر بھاگ رہا ہے۔پن ہے۔ کوے، کوئل، مینا، سو سو پن۔پھل ہیں۔پھل ہیں۔

دھنی رام کے رویے نے رگھو کی سوچ کو جیسے دنیا و مافیہا سے منقطع کر دیا۔اسے ٹھیک سا یاد نہ رہا کہ دھنی رام نے کیا پوچھا تھا اور اس نے کیا جواب دیا تھا۔اس کے دل میں نہ تو انعام وصولنے کا ولولہ باقی رہا اور نہ فراک خریدنے کی امنگ ہی۔اس کے چہرے پر مایوسانہ مسکراہٹ کھنڈ گئی اور وہ باولوں کی طرح خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھتا رہا۔

رگھو کو اس ڈھب میں دیکھ کر دھنی رام یہ سمجھ بیٹھا کہ شاید باغ کے کسی بھوت نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہوگا۔اس صورت حال سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔کوئی بندوبست کرنا چاہئے ورنہ باغ کی بدنامی ہوگی۔اب مشکل یہاں یہ تھی کہ بھوت کو بھگانے کے لئے اس سے بات کرنا ضروری تھا جب کہ بھوت کے نام سے ہی دھنی رام کی روح کانپ جایا کرتی تھی۔بات اگر دو ایک لاکھ روپوں کے نقصان کی ہوتی تو وہ برداشت بھی کر لیتا۔یہاں تو بھوت کے حوالے سے خاندانی باغ کی نیک نامی داؤ پر لگنے کو تھی۔چاہے کچھ ہو جائے بھوت سے بات کرنا ہی ہوگا۔

جی کڑا کر کے پوچھا۔ "آپ آئے کہاں سے ہو بھوت جی۔"

"بھ...... بھوت......؟" رگھو دفعتاً اچھل پڑا۔ "میں؟......"

"جی مہاراج......" سر کو جھکا کر دھنی رام ملائمت سے بولا۔

مٹھیاں بھینچ کر دھنی رام کو کاٹ کھانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے رگھو دل میں سوچا کہ اب تک کی بے عزتی ہی کیا کم تھی کہ مزید بھوت کا ٹھپہ لگا دیا۔ رگھو کی نظروں سے دھنی رام نے بھانپ لیا کہ بھوت کے تیور خطرناک ہوتے جا رہے ہیں اور وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ بھوت کو بھوت کہہ کر اس نے خواہ مخواہ بھوت کو ناراض کر دیا۔ اب اس کا ازالہ ضروری ہے۔ لہٰذا رسانت سے بولا۔ "مم میرا مطلب تھا آپ کون ہیں؟"

اس تغافل کوشی نے رگھو کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ یا تو پہلے بھوت کہہ کر خون کھولا دیا یا اب یوں بن رہا ہے جیسے کبھی کی پہچان ہی نہ ہو۔ ایسے طوطا چشم کے منہ لگنا ہی فضول ہے۔ ٹالنے کے ارادہ سے اس نے بیزارگی کا مظاہرہ کیا۔ "میں، میں دھوکہ کہ باپ ہوں۔"

"باپ؟" -دھنی رام اچنبھے میں پڑ گیا- "کس کا؟"

"منی کا" رگھو کا گلا بھرا گیا- اور دھنی رام کے خیال میں بھوت اب نرم پڑتا جا رہا تھا۔ مقصد برآری کے لئے ایسا ہی موقع اچھا ہوتا ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ بڑے بڑے تانترک بھوتوں کو بھینٹ چڑھا کر بھوت زدوں کو آزاد کرواتے ہیں۔ کیوں نہ بھوت کی خواہش جان لی جائے۔ اس نے پوچھا۔ "آپ کو کیا چاہئے مہاراج۔؟" رگھو کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ "کامدانی فراک"

دھنی رام حیرت میں پڑ گیا کہ بھوت تو انسانوں یا جانوروں کی بھینٹ کے رسیا ہوتے ہیں۔ یہ کیسا بھوت ہے کہ فراک مانگ رہا ہے۔ اسے استعارہ بھی نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ بھوتوں کو شاعری سے کیا کام۔ فراک کا مطلب فراک ہی ہے۔ کیوں کہ بھوت نے اپنی کسی بیٹی کا بھی کہا تھا۔ ممکن ہے فراک اسی کے لئے مانگا ہو۔ اس خیال کے باوجود بھی اک انجانی سے کشمکش اسے بے چین سا کرتی رہی۔ اس نے اپنے آپ سے کہا کہ بھوتوں نے کہیں انسانوں سے تہذیبی ٹکراؤ تو نہیں شروع کر دیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بھتنیوں نے اپنے روایتی کھوپڑیوں اور ہڈیوں والے سترکش لباس سے اوب کر اب انسانوں کے خلاف چیلنج کے طور پر فراک کا استعمال تو نہیں شروع کر دیا، جو بھی رہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بھوت کو کس طرح کا فراک چاہئے۔ اس نے یہ تو نہیں بتلایا تھا اس کی بیٹی دبلی تھی کہ موٹی، لمبی تھی یا ناٹی اور نہ یہ بھی کہ اس کا ٹیسٹ کیا ہے۔ اب مصیبت یہ تھی کہ انسانوں کے بازار میں بھوتوں کے آئیٹم کس دوکان ملیں گے۔ اور یہ بھی نہیں

پتہ کہ بھوتوں کے فراک سینے والا کوئی درزی اس شہر میں ہے بھی؟ سوچتے سوچتے جب سر چکرانے لگا تو اس نے اپنے آپ کو کوسا کہ بھوت کی طلب کا اس نے پوچھا ہی کیوں تھا۔ اب پچھتانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جو کرنا ہے جلد کرنا چاہئے ورنہ بھوت کی بیٹی ڈھیر سارے مطالبات کے ساتھ حاضر ہوسکتی ہے۔ خیر سے بیٹے بھی ہوئے تو ہاتھوں میں بھالے برچھیاں تھامے مجھے بھینٹ سمجھ کر لمبی لمبی زبانیں نکالے نکالے میرے اطراف ناچیں گے۔ اس تصور سے ہی وہ کانپ اٹھا۔ پھر الفاظ میں بناوٹی مٹھاس گھول کر منمنایا۔ ''دیکھے یہ معمولی فراک مجھے آپ کی شان کے خلاف لگتا ہے۔ گوشت نہ ہڈی یہ بھی کوئی بھینٹ ہوئی۔ حکم ہو تو بازار کے تمام جانور لا کر آپ کے قدموں میں ڈال دوں۔''

رگھو کے خیال میں پل پل میں بات بدل کر دھنی رام اس سے مذاق کر رہا تھا۔ وہ بخیل جو ایک فراک بھی نہ دے سکا خاک جانوروں کا بازار اٹھا لائے گا۔ ویسے بھی جانوروں کا میں کیا کروں گا۔ مجھے تو ایک فراک چاہئے اور دھنی رام مجھے دے گا نہیں۔ یہ مر جائے گا مگر ہاتھ سے پیسہ نہ چھوڑے گا۔ ناگاہ اس کے منہ سے قہقہہ بلند ہوا۔ ''ہاہاہا''

قہقہہ اتنا بلند تھا کہ آواز سے لرز کر دھنی رام نے چپکے سے یہاں سے کھسکنے میں عافیت جانی۔ بے آواز طریق پر الٹے پاؤں چلنے لگا۔ قہقہے بلند ہوتے گئے، وہ رفتار بڑھاتا گیا۔ پلٹ کر بھاگنے کی ہمت نہ کی۔ اس خوف سے کہ بھوت کہیں پیچھے سے آکر دبوچ نہ لے۔ وہ بھاگتا رہا، بھاگتا رہا۔ یہاں تک کہ رگھو کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگیا۔

○○

دھوپ کا سائبان

رحمان شاہی

وہ دو بہنیں مجھے بہت یاد آتی ہیں —— اور اُن کی خوف بھری نم آنکھیں، اُن کا اُڑا اُڑا چہرہ، تھر تھر کانپتا ہوا بدن ....

وہ سخت گھبرائی ہوئی تھیں۔

میں خالص مسلم محلے کی سرحد کے پاس رہتا تھا۔ اس سے لگ بھگ دو فرلانگ کی دوری پر کٹر ہندوؤں کی آبادی شروع ہوتی تھی جو بہت بڑے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میرا گھر لبِ سڑک تھا اور اس کے آزو بازو میں کوئی مکان نہ تھا۔ دائیں بائیں ٹرنک کی دکانیں تھیں جو میرے گھر سے شروع ہو کر ایک دوراہے پر جا کر ختم ہوتی تھیں۔ دوراہے کے دائیں طرف جو راستہ جاتا تھا وہیں سے ہندوؤں کی آبادی شروع ہوتی تھی۔ محلے کا نام بنگالی ٹولہ تھا۔ پھر آگے چل کر اس میں کئی ٹولے سمائے ہوئے تھے۔

بنگالی ٹولے کی آبادی دبنگ لوگوں سے شروع ہو کر دبنگ لوگوں پر ہی ختم ہوتی تھی۔ ان میں کچھ سیاسی جماعت کے لوگ تھے۔ کچھ بڑے بڑے بیوپاریوں کے مکانات تھے۔ آفیسر کلاس کے لوگ بھی رہتے تھے لیکن کرائے پر اور ان کی تعداد مختصر تھی۔

دوراہے کے بائیں طرف جو راستہ جاتا تھا وہ کمرشیل علاقہ تھا۔ وہاں پر بہت ساری چھوٹی بڑی دکانیں تھیں۔ کچھ کپڑے کی، کچھ اسٹیل کے برتنوں کی۔ ایک بڑا Sheo House بھی تھا، جہاں نئے فیشن کے جوتے اور چپل ملتے تھے۔ کرانے کی بھی کئی دکانیں تھیں۔ کچھ دکانیں مسلمانوں کی بھی تھیں۔

لیکن وہ چھوٹی چھوٹی تھیں۔ایک دکان لیدر بیگ کی تھی۔دو بٹن اور دھاگے کی۔سبھی اوسط درجے کی تھیں۔ ایک دکان سبزیوں کی بھی تھی۔سبزی فروش کا نام سلیم میاں تھا۔ان کی ناک ہمیشہ چڑھی رہتی تھی۔اوپر سے اور جگہوں کے مقابلے اُن کی سبزیوں کا بھاؤ کیلو میں روپیہ پچاس پیسے زیادہ ہوتے تھے۔البتہ سبزیاں بالکل تازہ ہوتی تھیں اور تول بھی پکا ہوتا تھا۔شاید اس وجہ سے ہی اُن کی دکان پر ہمیشہ بھیڑ جمی رہتی تھی۔

علاقہ میں جھنو میاں کبابی والے کی چکن کباب اور سلاد کی ایک مشہور دکان بھی تھی۔یہاں شام چھ بجے سے رات نو یا زیادہ سے زیادہ دس بجے تک کباب کھانے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا اور لوگ بیس سے پچیس کیلو کباب ہر روز چٹ کر جاتے تھے۔اُن میں بوڑھے جوان، عورت مرد اور بچے بھی ہوتے تھے۔

سلیم میاں سبزی فروش اور جھنو میاں کبابی والے کے گاہکوں میں مسلمان کم اور ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی۔

جھنو میاں کبابی والے کی چکن کباب کی دکان سے بالکل سٹے چورسیا جی پان والے کی ایک پان کی دکان بھی تھی۔چکن کباب کی طرح یہاں کا پان بھی مشہور تھا۔لوگ کباب کھانے کے بعد سیدھا پان کی اس دکان پر پہنچتے اور میٹھا پان کھاتے تھے۔ان میں بچے بھی اپنے والدین سے ضد کر کے میٹھے پان کی چھوٹی گلوری منہ میں دبانے سے باز نہیں آتے تھے۔

ضلع مجسٹریٹ کا آفس بھی اسی علاقہ میں تھا۔ناکا نمبر پانچ کے پاس۔ان کے بیچوں بیچ چھوٹے شاہ کی مزار تھی۔یہاں دور دور سے لوگ منتیں مانگنے آیا کرتے تھے۔سارے دن عقیدت مندوں کی بھیڑ جمی رہتی تھی۔

عقیدت مندوں میں مسلمان کم اور غیر مسلموں کی تعداد زیادہ تھی۔

اور چھوٹے شاہ کے مزار کے ٹھیک سامنے شو جی کا ایک چھوٹا سا مندر بھی تھا۔بہت مشہور مندر تھا یہ۔یہاں صبح سے شام تک بھکتوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔

کہتے ہیں کے چھوٹے شاہ کی مزار کا تبرک اور شو جی کے مندر کا پرشاد ملا کر کھانے سے لوگوں کی دلی مراد پوری ہو جاتی تھی۔بیمار صحت یاب ہو جاتے تھے۔

اس بارے میں جب لوگ چھوٹے شاہ کی مزار کے مجاور اور شو جی مندر کے پجاری سے بات کرتے تو وہ کوئی جواب نہیں دیتے تھے۔خاموش رہتے تھے۔البتہ وہ مسکراتے ضرور تھے۔

بڑی معنی خیز ہوتی تھیں اُن کی مسکراہٹیں۔

کمرشیل علاقے میں کئی بینک بھی تھے۔ریلوے اسٹیشن سب سے کنارے دکھن میں تھا۔بس اڈا

سے کچھ دوری پر اور ٹاؤن ہال شہر کے سب سے مشہور انگریزی اسکول کے پاس تھا۔ البتہ کچہری اس علاقہ سے باہر تھی۔ جیل خانہ سے ہٹے، پچھم کی طرف۔

اس شہر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہاں چوری چکاری کا ذرا بھی ڈر نہ تھا۔ میرے گھر کے دائیں بائیں دور دور تک بڑے بڑے ٹرنک دکانوں کے پاس ہی پڑے رہتے تھے۔ خواہ وہ دکانیں کھلی ہوں یا پھر بند۔ کبھی کبھی جب نماز کا وقت ہوتا تو دکاندار اپنی دکانیں کھلی چھوڑ کر پاس والی مسجد جو میرے گھر کے عین پچھواڑے تھی، بے خوف نماز پڑھنے چلے جاتے تھے۔ دن تو دن رات میں بھی بڑا اطمینان ہوتا تھا۔ کئی بار تو فرحت صدر دروازے سے ہٹے کمرے کو جو ہمارے گھر کا ڈرائنگ روم تھا اور جس میں قیمتی سامان رکھے ہوئے تھے، دیر رات تک کھلا چھوڑ دیتی تھی۔ پھر بھی کیا مجال جو گھر میں کوئی گھس جائے۔

ایک بار میں نے فرحت سے کہا تھا —— اس شہر میں چوروں کا اکال ہے۔ فرحت کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھی۔ پھر بولی تھی، پہلے میں بھی ایسا ہی سمجھتی تھی۔ پر چھوٹی قاضی پورا والی بوبو کہتی ہیں کہ اس شہر میں سیاست دانوں اور نیتاؤں کی بڑی تعداد ہے۔ ہر گھر اور ہر علاقہ کسی نہ کسی سیاسی جماعت کے نیتا یا نیتاؤں سے بھرا پڑا ہے، اس لئے چوروں کا قحط ہے۔

فرحت کی بات سن کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی۔

اس نے بڑا تیکھا طنز کیا تھا۔ وہ بھی بڑی معصومیت سے۔

گرمی کے زمانے میں سارا شہر نکھر جاتا تھا۔ شامیں بڑی رنگین ہوتی تھیں۔ شوخ لڑکیاں اپنے گھروں سے نکل کر چہل قدمی کرتیں اور منچلے اٹکھیلیاں کرتے۔ ان میں بوڑھے اور ادھیڑ عمر کی عورتیں اور مرد بھی شامل ہوتے۔ لیکن کوئی بُری بات نہیں ہوتی تھی۔ میں بھی روزانہ شام میں فرحت کو لے کر بنگالی ٹولہ والے ہائی اسکول کے کمپاؤنڈ میں چلا جاتا تھا۔ وہاں آم کا ایک بڑا باغیچہ بھی تھا۔ ہم دونوں اس باغیچے میں دیر تک گھومتے پھرتے تھے۔ بھولی بسری یادوں کو تازہ کرتے تھے۔ وہاں ہندوؤں کی دو چار فیملی بھی آتی تھی اور ان کے ساتھ ان کے بچے اور بچیاں بھی ہوتی تھیں۔ شوخ اور چنچل بچیاں۔ جوانی سے لدی پھندی۔

کبھی کبھی کوئی لڑکی بھا جاتی تو میں اسے فرحت کو دکھاتے ہوئے کہتا تھا:

''میرا دل کیسا کیسا تو کر رہا ہے...........''

فرحت میری شرارت سمجھ جاتی تھی۔ وہ بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے کہتی تھی:

''بری بات۔ اچھے بچے ایسا نہیں کرتے۔''

''میں بچہ نہیں ہوں۔ اب بڑا ہو گیا ہوں۔''

''جی ہاں .... اور بڑے ہو کر ندیدے ہو گئے ہیں۔''

فرحت اس شوخ لڑکی کو گھورتی، جو اُچھل اُچھل کر کچے آم کو توڑنے کی کوشش کر رہی ہوتی۔

میری آنکھیں بھی اسی پر ٹکی ہوتیں۔

فرحت دفعتاً ایک اچٹتی نگاہ مجھ پر ڈالتی۔ پھر کہتی ــــ

''اب ہم یہاں نہیں آئیں گے۔''

''کیوں ....؟''

دیکھنے نہیں بے شرمی کتنی بڑھ گئی ہے۔ جوان لڑکیاں جڈی پہنتی ہیں اور اُچھل کر کچے آم توڑتی ہیں۔ آپ خراب ہو جائیں گے۔''

فرحت کے لہجے میں بڑی معصومیت ہوتی تھی۔

میں کھلکھلا کر ہنسنے لگتا تھا ــــ پھر ہم گھر لوٹ کر دیر تک اس موضوع پر باتیں کرتے تھے۔ فرحت کہتی تھی، لڑکیوں کی چکنی چکنی رانوں کو دیکھ کر مرد حرصی ہو جاتے ہیں اور آپا کھو دیتے ہیں۔ آئے دن اخباروں میں ریپ کی خبریں چھپتی رہتی ہیں، آج فلاں شہر میں ایک نوجوان نے دس سال کی بچی کا ریپ کر دیا۔ آج فلاں گاؤں میں چار بدمعاشوں نے بارہ برس کی لڑکی کو پکڑا اور وہاں کے کھیت میں لے جا کر باری باری اس کے ساتھ ڈش کرم کیا۔ اس میں ان لڑکوں یا بدمعاشوں کا کیا قصور؟ پہلے زمانے میں کوئی بیس بائیس سال سے کم عمر کی لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اب تو دس بارہ برس کی لڑکیوں پر لوگ چوٹ کرتے ہیں۔ سارا قصور بدلتی ہوئی تہذیب کا ہے۔ لوگ اپنی بچیوں کو شلوار جمپر کیوں نہیں پہناتے ہیں............؟

میں فرحت کی باتوں سے اتفاق نہیں کرتا تھا۔ ہر روز دفتر آتے جاتے میں راستے میں مسلم گھروں کی بچیوں کو دیکھتا تھا۔ وہ بہت مختلف نہیں تھیں۔

میں فرحت سے کہتا، جس تہذیب کی تم کھلی اُڑا رہی ہو وہ ہماری تہذیب سے مختلف نہیں ہے۔ مسلم گھروں کی لڑکیاں بھی آج کے زمانے میں Short Skirt اور جڈی پہننے لگی ہیں۔ تہذیب کی پامالی کا نظارہ دونوں Community میں دیکھا جا رہا ہے۔

''میں نہیں مانتی ''فرحت صاف انکار کر دیتی اور میں اسے بھروسا دلانے لگتا، سچ کہتا ہوں، یقین کرو۔ دفتر آتے جاتے روز دیکھتا ہوں۔ اس پر فرحت اچانک بھڑک اٹھتی، تو آپ راستے میں لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے چلتے ہیں۔

فرحت کا موڈ بالکل خراب ہو جاتا۔ پھر تو میری شامت آ جاتی۔ بڑی مشکل اور تو بہ تلّا کے بعد میں اسے منا پاتا۔ پھر ہمت نہیں ہوتی اس موضوع پر اس سے بحث کرنے کی۔

میں جانتا تھا آگ لگنے پر کنواں کھودنا فضول ہوتا ہے۔

دسہرہ کا موقع تھا۔ مسلم محلوں میں بھی چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ ہر گلی کوچے میں میلے ٹھیلے کا ماحول تھا۔ جگہ جگہ رام لیلا بھی دکھائی جانے لگی تھی۔ سب سے بڑی رام لیلا کبیل پور محلے میں ہوتی تھی۔ دور دور سے لوگ اس رام لیلا کو دیکھنے آیا کرتے تھے۔ ان میں مسلمان بھی بڑی تعداد میں شامل ہوتے تھے۔ موج مستی کا سماں ہوتا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے۔ ہنسی مذاق اور ٹھٹھے بازی کرتے تھے۔ لیکن پانچویں کے روز ایک حادثے نے دسہرہ کا سارا ماحول بگاڑ دیا۔

سب سے بڑی رام لیلا شام سات بجے شروع ہو کر دیر رات میں ختم ہوئی تھی۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ جبھی ایک رکشے والے سے کسی بات پر ایک نوجوان کی کہا سنی ہوگئی۔ بات آگے بڑھی اور رکشے والے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ نوجوان کی جم کر پٹائی کر دی۔ نوجوان تنہا نہ تھا۔ اس کے کئی ساتھی پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ جب وہ جٹے تو رکشے والے پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ سبھوں نے اس کی اس بری طرح ٹھکائی کی کہ وہ وہیں پر ڈھیر ہو گیا اور نوجوان فرار ہو گئے۔ فرار ہونے والے سبھی نوجوان مسلمان تھے اور رکشے والا ہندو تھا۔ اس کے بعد ہی شہر میں گرم ہواؤں کی تیز آندھی سی چلنے لگی۔

رات سہمی ہوئی کسی ضعیف حال کی طرح آگے بڑھتی رہی اور کوئی ایسی ویسی بات نہ ہوئی۔ البتہ پو پھٹنے سے ذرا پہلے مسلمانوں کی کچھ دکانوں میں آگ ضرور لگائی گئی۔ کچھ لوگوں پر حملے بھی ہوئے اور انہیں زخمی بھی کیا گیا، لیکن پولیس کی چوکسی اور چپے چپے پر فوج کی تعیناتی نے حالات کو مزید بگڑنے نہ دیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لوگ جلد ہی سب کچھ بھلا کر ایک بار پھر تہوار کی موج مستی میں کھو گئے۔ لیکن اس کے بعد ایک اور حادثے نے شہر کی پر سکون فضا کو پاگل ہاتھی کی طرح روند کر رکھ دیا۔

دسہرہ کے روز مورتیوں کا باجے گاجے اور کھیل تماشے کے ساتھ ساگرمتی تالاب میں وسرجن کیا جا رہا تھا۔ یہاں بھی میلے ٹھیلے کا ماحول تھا۔ تالاب کے کنارے اور آس پاس مورتیوں کو وسرجن ہوتے دیکھنے کے لئے بڑی تعداد میں لوگ اکٹھا تھے۔ ان میں بوڑھے مرد عورت کے علاوہ بچے اور بچیاں، جوان جوان لڑکے اور لڑکیاں بھی موجود تھے۔ مسلم گھروں کے کچھ لڑکے اور لڑکیاں بھی میلا گھومنے آئے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا —— جبھی رات کے تقریباً دو بجے دو مورتیوں کے لوگوں میں پہلے ہم پہلے ہم کو لے کر تکرار شروع ہوگئی۔ پھر معاملے نے طول پکڑا اور دھکا مکی اور پھر لاٹھیوں اور ہتھیاروں کا کھلم کھلا استعمال ہونے لگا۔ میلے میں بھگدڑ مچ گئی۔ جس کو جدھر سینگ سمایا اُدھر بھاگا۔ اسی اثنا میں ساگرمتی

تالاب درگا کمیٹی نے عورتوں کے لئے ٹینٹوں کا جہاں نظم کیا تھا، عین اس جگہ کسی نے ایک بچی کا ریپ کر دیا اور فرار ہو گیا۔ بچی کو آناً فاناً میں مقامی اسپتال میں بھرتی کیا گیا۔ پھر کوئی بڑا حادثہ نہ ہوا۔ البتہ سیر و تماشے کے لئے آئے لوگوں کی بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ میلا ٹھیلا ختم ہو گیا تھا۔ پولیس نے بڑی مستعدی سے مورتی وسرجن کا کام پورا کرایا تھا۔

درگا پوجا کا تہوار گذر گیا۔ لیکن شہر میں جو نفرت کی آگ لگی تھی، نہیں بجھی۔ روز جلسے اور جلوسوں کا بازار گرم ہوتا۔ گرما گرم افواہیں ایسے اٹھتیں، جیسے شہر میں کوئی خونخوار درندہ گھس آیا ہو جو کسی پل بھی لوگوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دیگا۔ پہلے ہندوؤں کی باری تھی۔ انہوں نے جم کر اُدھم مچایا۔ سلیم میاں سبزی فروش کی سبزیاں لوٹ لیں۔ جھنو میاں کبابی والے کو جم کر مارا پیٹا۔ سرکاری املاک کو بھی نقصان پہنچایا۔ لیکن جب پتہ چلا کہ جس بچی کا ریپ ہوا، وہ ہندو نہیں مسلمان ہے تو ہندو کچھ ٹھنڈے پڑ گئے اور مسلمانوں نے واویلا مچانا شروع کر دیا۔ ہر محلے میں جلسے ہونے لگے۔ میں جس محلے میں تھا وہاں بھی ایک بیٹھک ہوئی اور بدلہ لینے کی بات کی گئی۔ میں غیر مقامی تھا اور ڈرا ہوا تھا۔

فرحت بھی گھبرائی ہوئی تھی۔

وِجیا دشمی گذر جانے کے بعد تیسرے روز جب میں دفتر سے لوٹا تو کپڑے بھی نہیں بدلے تھے کہ فرحت نے سوالات کی جھڑی لگا دی ـــــ

''اب حالات کیسے ہیں ....؟''

''پہلے سے بہتر ہیں۔''

''اور وہ بچی..........؟''

''بچی بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور اب اپنے والدین کے ساتھ ہے۔''

''مجرم پکڑے گئے..........؟''

''نہیں ..... لیکن جلد ہی پکڑ لئے جائیں گے۔ پولیس سر توڑ کوشش کر رہی ہے۔''

''بس کوشش ہی کر رہی ہے نا..........''

''تو اور کیا کرے گی .... پولیس کے پاس جادو کی کوئی چھڑی تو ہوتی نہیں ہے جو..........''

''بس رہنے دیجئے ....'' دفعتاً وہ ٹوکتے ہوئے بولی ـــــ میں تو کہتی ہوں، ساری غلطی اُس بچی کی ہے۔ اُسے ہندوؤں کا تہوار منانے کی کیا پڑی تھی ....؟''

''اس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ ہمارا ایک دوسرے کے پرب تہوار میں شامل ہونا قومی یکجہتی کی علامت ہے۔''

"بھاڑ میں جائے ایسی قومی یکجہتی.........." فرحت دفعتاً جلبلا کر بولی ـــ

"چھوٹی قاضی پورا والی بوبو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی، محض بارہ برس۔ ننھی سی جان۔ درندوں نے بوٹی بوٹی نوچ لی اور آپ کہتے ہیں، یہ قومی یکجہتی کی علامت ہے۔ میں تو سو بار جھاڑو لگاؤں ایسی قومی یکجہتی کو۔"

فرحت چڑھی ہوئی تھی۔ میرا موڈ نہیں تھا اس سے مزید بحث کرنے کا۔

میں نے ٹالتے ہوئے کہا ـــ

"یہ حادثہ ہماری اسی تہذیب کی پامالی کا ثبوت ہے جس کی دہائی دیتے تم نہیں تھکتیں۔"

میرے لہجے میں تھوڑی کڑواہٹ تھی جس کو شاید فرحت نے محسوس کر لیا تھا۔

وہ پھر کچھ نہیں بولی۔ چپ چاپ کچن میں کھسک گئی۔

ایک ہفتہ سے زیادہ گذر گیا۔ ابھی تک پولیس بچی کے مجرموں کو پکڑنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ جلسے اور جلوسوں کا بازار گرم تھا۔ کئی سیاسی جماعتیں روٹی سینکنے میں سرگرم تھیں۔ چند نیتا ایسے تھے جو مسلمانوں کو اکسا رہے تھے۔ ایک مقامی لیڈر نے تو کھلم کھلا اعلان بھی کر دیا تھا، ہم اس کا بدلہ لیں گے، چاہے کچھ ہو جائے۔

پیر کا دن تھا۔ مسلمانوں کا ایک بڑا جلوس سارے مسلم علاقوں سے گھومتا ہوا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے دفتر پہنچا۔ جم کر نعرے بازی ہوئی۔ کئی گاڑیوں کو نقصان پہنچایا گیا۔ پولیس دیر تک بے قابو جلوس کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن کامیابی نہیں ملی۔ مجبوراً لاٹھی چلانی پڑی، جس سے زبردست بھگدڑ مچ گئی۔ کئی لوگ زخمی بھی ہوئے اور کمرشیل چوک کی طرف بھاگے ـــ دیکھتے دیکھتے وہاں ایک مجمع اکٹھا ہو گیا۔ پھر وہ مجمع ایک جلوس کی شکل میں میرے علاقے کی طرف کوچ کر گیا۔ فرحت کی گھبراہٹ بڑھ گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کروں۔ میں جانتا تھا کہ رکشے والے کے قتل کو لے کر ہندوؤں میں بھی زبردست غصہ ہے۔ وہ بدلہ لینے کے ارادے سے جہاں تہاں گھات لگائے بیٹھے ہیں۔

ہندوؤں کی رہنمائی کٹر ہندو سنگھٹن کا ایک مقامی لیڈر کر رہا تھا۔

جلوس دھیرے دھیرے میرے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سبھوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور ہاکی اسٹک تھے۔ وہ نعرہ بھی لگا رہے تھے ـــ انقلاب زندہ باد.......... زندہ باد زندہ باد.......... اللہ اکبر .... اللہ اکبر.........."

میں گھر سے باہر آ گیا۔ فرحت بھی ساتھ تھی۔ ہم نے دیکھا، ابھی جلوس کمرشیل چوک سے کچھ ہی آگے بڑھا تھا۔ فرحت جلوس کے تیور دیکھ کر ایکدم ڈر گئی اور بولی ـــ

"اللہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ آپ کچھ کرتے کیوں نہیں۔ کوئی دوسرا گھر دیکھتے۔ ایکدم سرحد پر ہیں۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا، گھر ایسے علاقے میں لیجیے گا جہاں کوئی خطرہ نہ ہو۔ لیکن آپ.........
آپ تو کبھی میری بات مانتے ہی نہیں۔ پہلے بھی جو تبادلہ ہوا تھا تو آپ نے مخلوط آبادی والے علاقے میں گھر لیا تھا۔ وہ تو خیر ہے........."

"چپ رہو۔ ہمیں کوئی خطرہ وطرہ نہیں ہے۔ ہم محفوظ ہیں۔"

میں نے فرحت کو ڈانٹ دیا۔

"ہم محفوظ نہیں ہیں۔ وہ دنگائی ہیں........." فرحت جلوس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تقریباً چیخ کر بولی ــــ "ان کا کوئی بھروسا نہیں۔"

"ہمیں اندر چلنا چاہئے........."

میں نے فرحت کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ جبھی میں نے دیکھا ــــ جلوس کے مخالف سمت سے چھوٹی بڑی دو لڑکیاں بھاگتے ہوئے میرے دروازے کے پاس آئیں اور ٹھٹھک کر رک گئیں۔

وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھیں۔

چہرے کا رنگ فق تھا۔

چند لمحات ایسے ہی گذر گئے۔ پھر ہم نے دیکھا ــــ جوں جوں جلوس آگے بڑھ رہا تھا، لڑکیوں کی بوکھلاہٹ بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ بار بار جلوس کو اور کبھی ہماری طرف دیکھ رہی تھیں.........اور اس سے پہلے کہ میں ان دونوں کے بارے میں کچھ سوچتا، کوئی فیصلہ لے پاتا، فرحت نے اشارے سے اُنہیں اندر بلا لیا۔

وہ بوکھلائی ہوئی سی فوراً اندر آ گئیں اور کپکپاتی ہوئی آواز میں بولیں ــــ

آن......آنٹی......دروازہ بند کر لیں۔ وہ آ رہے ہیں......ہمیں کاٹ دیں گے........."

وہ ایکھڑ کر رونے لگیں.........

"کچھ نہیں ہوگا ...." فرحت نے ڈھارس بندھایا ــــ "تمہیں کچھ نہیں ہوگا.........
ہم لوگ ہیں نا.........اور تمہارے انکل........." فرحت نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ــــ "یہ بدمعاشوں سے نپٹنا خوب جانتے ہیں۔"

میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر چھائے خوف کے بادل دفعتاً تھوڑا اچھٹ گئے ہیں۔

میں نے دروازہ بند کر دیا۔

میں فرحت کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی فرحت ہے جو چند لمحات قبل گھبرائی ہوئی تھی اور مجھے برا بھلا کہہ رہی تھی کہ میں نے ایسی غیر محفوظ جگہ پر گھر کیوں لیا اور وہ دنگائی ہیں۔ ان کا کوئی بھروسا نہیں۔

لڑکیاں ابھی تک کھڑی تھیں۔ بہت گھبرائی ہوئیں۔ ان کی ٹانگیں لرز رہی تھیں اور آنکھیں دروازے پر ٹکی تھیں۔

فرحت نے بڑی لڑکی سے بیحد نرم لہجے میں پوچھا ——

''کیا نام ہے تمہارا، کہاں رہتی ہو.........؟''

''را......رشمی......'' اس کی آواز ابھی بھی کانپ رہی تھی ——

''اور یہ میری چھوٹی بہن سوئٹی۔ وہ اُدھر.........اُدھر بنگالی ٹولہ میں رہتی ہوں۔''

فرحت صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی ——

اطمینان سے بیٹھو، گھبرانا نہیں۔ میں پانی لے کر آتی ہوں۔''

دونوں بہنیں جلدی سے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

فرحت اندر کچن میں چلی گئی۔

میری آنکھیں ان پر ٹکی تھیں —— دونوں غضب کی خوبصورت تھیں۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ رشمی پندرہ سولہ سال کی ہوگی اور سوئٹی دس بارہ کی۔ دونوں طالبات معلوم ہو رہی تھیں۔ ہاتھ میں کتابیں اور کاپیاں تھیں۔ شاید ٹیوشن لے کر آرہی تھیں۔ اچھی فیملی سے لگتی تھیں۔ چہرے مہرے سے ایسا ہی ظاہر ہوتا تھا۔ کپڑے سادے مگر قیمتی پہنے ہوئے تھیں۔ رشمی فالسائی رنگ کا جمپر اور اسی رنگ کے شلوار میں تھی اور سوئٹی کے جمپر کا رنگ سرخ اور شلوار کالے رنگ کی تھی۔ دونوں نے دوپٹہ بھی اوڑھا ہوا تھا۔ مجھے تو وہ مسلم گھرانے کی لگ رہی تھیں۔ تہذیب وتمدن سے سجی سنوری۔

سوئٹی بہت ڈری ہوئی تھی۔ رشمی کی گود میں سر رکھے سسک رہی تھی اور رشمی پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی —— کمرے میں دیوار پر جگہ جگہ اردو کلینڈر جھول رہے تھے اور دروازے کے عین اوپر آیت الکرسی ایک خوبصورت فریم میں جڑی لٹک رہی تھی۔

میں دیکھ رہا تھا —— رشمی کے چہرے کا رنگ فق تھا۔

وہ کانپ بھی رہی تھی۔

دفعتاً رشمی نے عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھا —— وہ بے چین تھی۔ شاید اس کے دل میں کوئی کھٹکا تھا —— میں سفید قمیص اور لنگی پہنے دیوار سے لگ کر کھڑا ایک ٹک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

جبھی فرحت ٹرے میں پانی کا دو گلاس لئے داخل ہوئی اور ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی ——

"آپ دونوں پانی پی لو........"

رشمی نے چونک کر فرحت کو دیکھا —— پھر پانی سے بھرے گلاس کو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے گلاس میں پانی نہیں زہر بھرا ہو۔

فرحت بولی ——

"پی لو........ میں کچھ کھانے کے لئے بھی لاتی ہوں........"

"نہیں نہیں........" رشمی فوراً بولی —— "آپ کہیں نہ جائیں۔ ہم ٹھیک ہیں۔"

اس کی آواز کانپ رہی تھی اور آنکھیں مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں۔

فرحت رشمی سے سٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

باہر شور بڑھتا جارہا تھا۔ عجیب عجیب نعرے اُٹھ رہے تھے۔ کبھی انقلاب زندہ باد تو کبھی جو ہم سے ٹکرائے گا، چور چور ہو جائے گا —— اور کمرہ ایک پراسرار خوف و دہشت سے بھر گیا تھا۔ رشمی کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی اور سوئٹی ابھی بھی اس کی گود میں منہ چھپائے رو رہی تھی اور بڑبڑا رہی تھی، جیسے کوئی عالم سحر میں بک رہا ہو —— "دیدی مجھے ڈر لگ رہا ہے........ دیدی مجھے ڈر لگ رہا ہے........ مسلمان لوگ کاٹ دیں گے........ دیدی........"

رشمی رہ رہ کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی شبہ تھا۔ کوئی شک، کوئی گمان اور مجھے نہ جانے کیوں ایک عجیب سی شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ ایسی شرمندگی جیسے میں نے کوئی گناہ کیا ہو، کوئی گھناؤنی حرکت اور اس نے دیکھ لیا ہو۔

جلوس گھر کے بالکل پاس آ گیا تھا۔ لوگ ٹرنک پر لاٹھیاں برسا رہے تھے۔ دھائیں دھائیں سی آواز ہو رہی تھی، جیسے دور بہت دور کہیں متواتر توپ چل رہے ہوں۔ دہشت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میرا دل بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ شاید کچھ ہونے والا تھا۔ کچھ اور بہت کچھ۔

دفعتاً میرے دروازے پر دو چار لاٹھیاں گریں اور اس کے ساتھ ہی شور اٹھا ——

"نعرہ تکبیر اللہ اکبر ...."

میں سر سے پاؤں تک ہل گیا۔ پھر غیر ارادی طور پر میرے منہ سے بھی نکلا ——

"نعرہ تکبیر اللہ اکبر........"

رشمی اور سوئٹی کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی ——

اور مجھے فوراً خیال آیا، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور؟ میرے منہ سے تو

خود بخود ....

فرحت انہیں ڈھارس بندھا رہی تھی ـــــ

"کچھ نہیں ہوگا .... کچھ نہیں ہوگا ...."

"وہ .... وہ انکل ...."

رشمی کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔ البتہ اس کی مشکوک نگاہیں مجھ پر ٹکی رہیں۔ میں سر سے پاؤں تک تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ندامت بھرا کوئی احساس تھا یا زہر کا کوئی پیالہ، میں گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا ـــــ

"بے ...... بے بیٹا! ڈرومت، تمہیں بچانے کے لئے میں، میں نے ...."

میرا گلا رُندھ گیا۔ آنکھیں نم ہوگئیں۔ چاہ کر بھی کچھ نہیں کہہ سکا۔

رشمی کی مشکوک نگاہیں ابھی تک مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں اور چہرے پر خوف و دہشت کے گھنے بادل چھائے ہوئے تھے اور سوئی ـــــ سوئی کی خوف کے مارے شاید آنکھ لگ گئی تھی یا پھر وہ نڈھال تھی اور ابھی تک رشمی کی گود میں منہ چھپائے آواز نکالے بغیر سسک رہی تھی۔

باہر کا شور تھم گیا تھا۔ شاید جلوس ہمارے گھر سے گذرتا ہوا اب کسی دوسرے مسلم علاقہ میں داخل ہو چکا تھا۔

چند لمحات تک کمرے میں بھی سناٹا چھایا رہا۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سبھوں کے دل کی دھڑکنیں تھم گئی ہیں۔

چند اور لمحات اسی طرح گذر گئے۔ پھر میں نے رشمی سے کہا ـــــ

"چلو میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔"

میں دروازے کی طرف بڑھا۔ جبھی فرحت بولی ـــــ

"رُکیے، ٹھہریے ...... پہلے ...."

میں سمجھ گیا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے فرحت پوری طرح اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے کہ نہیں۔

میں نے ٹوکتے ہوئے کہا ـــــ

"اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔ جلوس گذر گیا۔"

اور میں دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ ادھر اُدھر دائیں بائیں دیکھا ـــــ میری نظر ظفرو پر پڑی ـــــ وہ اپنی دکان کھول رہا تھا۔

میں نے دھیمی آواز میں اسے پاس بلایا ——

"اے ظفرو .... ذرا ادھر آنا ...."

ظفرو نے چونک کر میری طرف دیکھا ——

"ارے آپ .... ظلو بھائی آپ ...."

وہ لپک کر میرے پاس آگیا۔ پھر بولا ——

"آپ باہر کیوں ہیں .... اور یہ دونوں کون ہیں ....؟"

اُس کی آنکھیں میرے پیچھے سہمی کھڑی رشمی اور سوئٹی کو گھور رہی تھیں۔

"وہ ...." میں ایکدم گھبرا گیا —— "وہ تمہاری بھابی کی سہیلی ہیں نا، ان کی یہ بیٹیاں ہیں۔ تم کیا کر رہے تھے ....؟"

"پیسے نکال رہا تھا۔ شہر میں کرفیو لگ گیا ہے نا، کیا پتہ کس وقت ...."

"کرفیو ...."

میں نے گھبرا کر ٹوکا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ شہر میں کرفیو لگ گیا ہے۔

ظفرو نے حیرت کا اظہار کیا ——

"آپ کو نہیں معلوم .... ارے اِدھر مسلمانوں نے احتجاجی جلوس نکالا، اُدھر غصے میں ہندوؤں نے اپنے علاقوں میں مسلمانوں کی دکانیں پھونک دیں۔ کچھ لوگوں کو مارا پیٹا بھی۔ پھر کرفیو کیسے نہ لگتا۔"

اُس کی آنکھیں ابھی بھی رشمی اور سوئٹی کو گھور رہی تھیں۔

چند لمحات تک خاموشی رہی۔ پھر ظفرو نے رشمی اور سوئٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ——

"یہ دونوں ہندو ہیں ....؟"

"ہاں .... لیکن تمہیں اس سے کیا۔"

"ایسے حالات میں ان کا آپ کے ساتھ ...."

"بکومت .... میں انہیں گھر چھوڑنے جارہا ہوں۔"

"کہاں ....؟"

"بنگالی ٹولہ میں ...."

یہ مناسب نہ ہوگا ظلو بھائی۔ بہت خطرہ ہے۔ ہندو لڑکیوں کیلئے آپ اپنی جان جوکھم میں کیوں ڈال رہے ہیں۔"

''چپ رہو......''میں نے ظفرو کو ڈپٹ دیا۔ پھر فوراً خیال آیا، کہیں یہ کوئی گڑ بڑ نہ کردے۔ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا — ''کچھ نہیں ہوگا ظفرو۔ بس چار قدم چلنا ہے۔ میں یوں گیا اور یوں آیا۔ جب تک تم ٹھہرو۔''

پھر فرحت سے بولا —

''ظفرو کو چائے پلاؤ۔''

''میں......''ظفرو میری باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا —

''میں سچ کہتا ہوں ظلو بھائی......سوچ لیں۔ اس قمیص اور لنگی میں تو صاف پہچان لئے جائیں گے......''

شاید ظفرو ٹھیک کہتا ہے، ایک پل کے لئے میرے دل میں خیال آیا۔ مجھے لباس تبدیل کر لینا چاہئے۔ پھر فوراً یاد آیا، کہیں دیر نہ ہو جائے۔

میں نے رُمی اور سوئی کو دیکھا — وہ خوف زدہ تھیں۔ ان کی ٹانگیں پھر لرز رہی تھیں اور آنکھیں ظفرو پر ٹکی تھیں۔

میں نے قمیص اور لنگی کی پرواہ نہ کی اور انہیں لے کر بنگالی ٹولہ کی طرف چل پڑا۔ فرحت بس اتنا بولی تھی، احتیاط سے......خدا حافظ۔

فرحت کے لہجے میں بے پناہ اضطراب تھا۔ پل بھر کے لئے مجھے محسوس ہوا جیسے میں کسی جنگ کے میدان میں جا رہا ہوں، کوئی جنگ لڑنے۔

میں سنبھل سنبھل کر آگے بڑھ رہا تھا اور رُمی اور سوئی ایک مختصر سا فاصلہ بنائے ہوئے میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔

ہم مسلم علاقے کو پار کرتے ہوئے بنگالی ٹولہ میں جیسے ہی داخل ہوئے، رُمی اور سوئی لپک کر میرے آگے چلنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا فاصلہ کافی بڑھ گیا۔ البتہ تھوڑی دیر پر وہ دونوں پلٹ کر میری طرف دیکھ لیتی تھیں اور مجھے ان کی آنکھوں میں وہی چمک محسوس ہوتی تھی جو کسی شکاری کی گرفت سے آزاد ہوئی ہرنوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

رُمی اور سوئی ایک گھر کے پاس جا کر ٹھہر گئیں — جبھی کسی طرف سے ہتھیار بند نوجوانوں کی ایک ٹولی آئی اور انہیں گھیر لیا۔ مجھے شک ہوا، کہیں......کہیں یہ لوگ......یہ لوگ......میں اچانک چیخ پڑا — ''خبردار......خبردار جو میری بچیوں کو ہاتھ لگایا......''

ہتھیار سے لیس نوجوانوں نے پلٹ کر مجھے دیکھا — پھر ایک دوسرے کو آنکھوں آنکھوں میں

کوئی اشارہ کیا اور میری طرف بڑھنے لگے۔ وہ ابھی بہت دور تھے۔ لیکن میں نے دیکھا، ان کی آنکھوں میں نفرت تھی اور چہرے غصّے سے جھلس رہے تھے۔

پھر بھی میں آگے بڑھتا رہا۔ جبھی رشمی اور سوئی نے اشارے سے مجھے لوٹنے کے لئے کہا اور میں ٹھٹھک کر رک گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ ہتھیار بند نوجوانوں کی پوری ٹولی میری طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔

میری آنکھیں رشمی اور سوئی پر ٹکی تھیں۔ وہ خوف زدہ تھیں۔ اُن کے چہرے کا رنگ ایک بار پھر اُڑ گیا تھا۔

وہ سر سے پاؤں تک کانپ بھی رہی تھیں۔

دفعتاً وہ چیخنے لگیں —— "انکل لوٹ جایئے......... لوٹ جایئے......... ہم سر چھت ہیں۔ آپ لوٹ جایئے........."

نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میرے پاؤں کو زمین نے جیسے کس کر پکڑ لیا تھا۔ چاہ کر بھی اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ شاید کوئی خوف تھا جس نے میری ساری طاقت نچوڑ لی تھی یا پھر.........

وہ لوگ بس چند گز کے فاصلے پر تھے —— جبھی رشمی اور سوئی ایک بار پھر زور زور سے چیخنے لگیں —— انکل لوٹ جایئے......... لوٹ جایئے......... بھگوان کے لئے لوٹ جایئے۔ وہ لوگ آپ کو مار ڈالیں گے........."

دونوں زار و قطار رو رہی تھیں، جبھی مجھے جیسے ہوش آ گیا یا پھر کسی نے دھکا دیا تھا۔ کوئی قوت، انجانی سی کوئی طاقت —— میں بلا تاخیر پلٹ کر بھاگا اور بھاگتا رہا —— پھر بنگالی ٹولہ کے موڑ پر جہاں سے میرا علاقہ شروع ہوتا تھا، ٹھہر گیا اور پلٹ کر دیکھا کہ ہتھیار بند نوجوانوں کی پوری ٹولی دور کھڑی مجھے خونخوار نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

میں اُن کی پہنچ سے باہر تھا۔

میں نے اُن کی پرواہ نہ کی اور رشمی اور سوئی کو دیکھنے لگا —— اُن کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اب مسکرا رہا تھا۔

اور آنکھوں میں کوئی خوشی تھی جو رقص کر رہی تھی۔

○○

باغی

مشتاق احمد وانی

اس کا نام جیون داس تھا، ماں باپ کا اکلوتا بیٹا، بیحد ذہین اور خوبصورت تھا۔ آٹھویں جماعت ہی سے کئی شوخ وچنچل قسم کی حسینائیں اس پہ فدا تھیں مگر وہ بھی بڑے کٹھور دل کا تھا اس نے نہ معلوم یہ راز کیسے جان لیا تھا کہ ایک طالب علم کا کسی حسینہ سے عشق کرنا اس کی بربادی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اسی لئے اس نے اپنا تعلیمی سفر پھونک پھونک کر طے کیا تھا۔ مگر بالآخر جب وہ کیمسٹری میں ایم ایس سی کر رہا تھا تو کومل نام کی لڑکی نے اپنے حسن وجمال اور عشق کی تپش سے اسے موم بنا دیا تھا، وہ خود تو برہمن زادہ تھا اور کومل رام داسی تھی لیکن 'محبت' ذات، پات، اونچ نیچ، دین دھرم اور امیری غریبی نہیں دیکھتی۔ دونوں کے دلوں میں محبت کی چنگاری بھڑک اٹھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے بنا اداس رہتے تھے۔ پھر ایک دن انہوں نے تمام خاندانی اور سماجی بندھنوں، رسموں، رواجوں اور عقیدوں کی پرواہ کئے بغیر کورٹ میرج کر لی۔ کومل کے ماں باپ نے اس کے اس جرأت مندانہ اقدام پر کوئی خاص ناراضگی ظاہر نہیں کیا کیوں کہ وہ کسی حد تک اس بات پر فخر محسوس کر رہے تھے کہ ان کی بیٹی ایک برہمن زادے کو اپنا یا عاشق بنانے میں کامیاب ہوئی ہے مگر جیون داس کے والدین نے جب اپنے بیٹے کا یہ انوکھا کارنامہ سنا تو انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے ان کے چہروں پر کالک پوت دی ہو۔ ہر ماں باپ کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ ان کے بیٹے یا بیٹی کی برات سجے، ڈولی اٹھے اور اپنے پرائے سبھی شادی جیسے پر مسرت موقعے پر مدعو کئے

جائیں، گیت گائے جائیں اور جشن منایا جائے، جیون داس کے والدین نے بھی دل ہی دل میں اس کی شادی کے کئی ارمان پال رکھے تھے مگر اس نے ان کی تمناؤں کا کوئی بھی خیال نہ رکھتے ہوئے کومل جیسی نیچ ذات کی حسین و جمیل اور سلیقہ شعار لڑکی کو اپنی بیوی بنالیا۔ دراصل جیون داس بچپن ہی سے آزاد خیال اور باغیانہ طبیعت کا حامل تھا، وہ کرم دھرم اور ذات پات پہ بالکل یقین نہیں رکھتا تھا۔ جب وہ سماج میں ذات پات میں بٹے لوگوں کو دیکھتا یا مذہب اور دھرم کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم اور تصادم دیکھتا تو اس کا دل اندر ہی اندر چھلنی ہو جاتا اس کے ذہن میں بار بار یہ سوال ابھرتا کہ نسل آدم اعضائے بدنی کے اعتبار سے بالکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ دو آنکھیں، دو کان ایک ناک، ایک منہ، ایک زبان، دو ہاتھ، دو ٹانگیں، دو پاؤں اور خون میں بھی کوئی فرق نہیں بالکل سرخ رنگ کا تو پھر یہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، بودھ اور جین کے علاوہ بے شمار ذاتوں اور عقیدوں میں بٹا یہ انسان آخر کیا؟

الیکشن کے دوران نیتا لوگ سفید لباس میں ملبوس اپنا ووٹ بینک بنانے کی خاطر دھرم اور مذہب کی آڑ لے کر عوام کے جذبات و احساسات سے کھیلتے اور اس طرح کی تقریریں کرتے۔

"میرے دیش واسیوں: اپنے اندر جاگریتی پیدا کرو، ہندو دھرم خطرے میں ہے، ہندو وہی ہے جو اپنے دھرم اور دیش کی رکھشا کرے۔ کیا تم یہ نہیں چاہتے ہوں کہ بھارت میں رام راجیہ قائم کیا جائے"

دوسرا نیتا مسلمانوں سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے اس طرح کی زہر افشانی کرتا۔

"میرے مسلم بھائیو اور بہنو! اسلام خطرے میں ہے اور تم غفلت کی نیند سوئے پڑے ہو کل خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے، ہم مسلمان ہوتے ہیں اور تمہیں پتا نہیں کہ مسلمانوں کے کیا کام ہوتے ہیں۔ اب کی بار مجھے کامیاب کراؤ گے تو اسلام گھر گھر میں داخل کراؤں گا، امن چین کی زندگی جیو گے"

سیاسی نیتاؤں کی یہ اشتعال انگیز تقریریں سنتے وقت جیون داس کو یوں محسوس ہوتا کہ جیسے کسی خاص جرم کی پاداش میں ایذا رساں آدمی اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ بھر رہا ہو۔ کبھی کبھی وہ کافی جذباتی ہو جاتا، اس کا جی چاہتا کہ وہ سب کو للکار کر کہے کہ چھوڑ دو یہ دھرم، مذہب، ریتی، رواج، ذات، پات، فرقہ پرستی اور چھوت چھات کے تمام ڈھونگ، اپنے اپنے خول سے باہر نکل آؤ، دھرم مذہب اور ذات پات سے اوپر اٹھ کر انسانیت کے پلیٹ فارم پر جمع ہو جاؤ۔ چھوٹی ہی عمر سے اس کے دل میں یہ لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا اور آج اس نے کومل جیسی نیچ

ذات کی لڑکی سے شادی کر کے ذات پات، چھوت چھات اور اونچ نیچ کی تمام دیواریں توڑ دی تھیں وہ آج اطمینان سا محسوس کر رہا تھا۔ کیمسٹری میں ایم ایس سی ہونے کی حیثیت سے وہ ہر چیز کو سائنٹفک طریقے پر جانچنے پرکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ سماجی بندشوں، رسموں، رواجوں اور دین دھرم کی صداقت سائنٹی فک طریقے پر معلوم کرے مگر اسے اپنے تمام تجربات و مشاہدات سے یہ سب انسان کی انانیت، غریبوں کا استحصال اور توہم پرستی کی بھیانک صورتیں یہ سب انسان کی انانیت، غریبوں کا استحصال اور توہم پرستی کی بھیانک صورتیں معلوم ہو رہی تھیں۔ مغربی فلاسفہ اور سائنسدانوں کے کارناموں سے وہ بخوبی واقف تھا۔ وہ سقراط، افلاطون، ارسطو، کارل مارکس، فرائڈ، ڈراون، یونگ، نطشے، جان اسٹارٹ مل کے علاوہ گلیلو، کوپرنکس، نیوٹن، گراہم بیل، رائٹ برادریس، مارکونی، تھامس ایڈیسن، اور چارلس بیج کے کارناموں سے وہ بیحد متاثر تھا اس لئے وہ ہر چیز کو سائنسی نقطہ نظر سے دیکھنے کا قائل تھا۔ سائنس اس کے دماغ میں اس حد تک گھس گئی تھی کہ وہ تمام سماجی، اخلاقی، روحانی، اور مذہبی اقدار کو انسان کی خود غرضی سے تعبیر کرتا تھا۔

کورٹ میریج کے فوراً بعد جیون داس اور کومل ہنی مون منانے مسوری اور نینی تال چلے گئے۔ دس دن کے بعد جب جیون داس اپنی شریک زندگی کے ساتھ اپنے والدین کے لئے بہت سے تحفے لے کر گھر پہنچا تو اس کی ماں گھر کے آنگن میں بیٹھی اپنی قسمت کا رونا رو رہی تھی اور اس کا باپ واسدیو ایک کمرے میں بستر پہ لیٹا اس گھڑی پر کف افسوس مل رہا تھا کہ جب اس نے جیون داس کو اسکول میں داخل کروایا تھا۔ غم و غصے سے اس کا دماغ ابل رہا تھا۔ جیون داس مسکراتے ہوئے ماں کی طرف بڑھا تا کہ اس کے چرن چھوئے اور آداب بجالائے۔ مگر ماں اسے دیکھتے ہی ایک بپھری شیرنی کی طرح دور ہٹ گئی اور بولی "مجھ سے دور ہو جا تو میرا بیٹا نہیں ہے، تو نے پورے خاندان کے عزت خاک میں ملا دی ہے۔ میرا دھرم بھرشٹ کرے گا۔ نکل جا یہاں سے اور اس پچمارن کو بھی میری نظروں سے دور لے جا۔"

ماں کے اس حقارت آمیز رویے پر جیون داس اور اس کی بیوی کومل بالکل ناراض نہیں ہوئے بلکہ دونوں زور سے ہنس پڑے۔ جیون داس نے کہا:

"ماں جی! آپ بلاوجہ ناراض ہو رہی ہیں۔ اپنی مرضی سے شادی کرنا میرا حق تھا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم سب انسان ہیں، ہم پڑھے لکھے لوگ چھوت چھات اور ذات پات پہ یقین نہیں رکھتے" پھر اس نے کومل کو کہا:

''کومل! جاؤ میری ماں کا منہ میٹھا کراؤ''

کومل نے مٹھائی کا ڈبہ کھولا اور ایک پیس ہاتھ میں اٹھا کر اپنی ساس کی طرف بڑھی۔ پتلون اور جیکٹ میں اس کا سڈول جسم کچھ زیادہ ہی دلکش دکھائی دے رہا تھا، مگر جیون داس کی ماں دیر تک اسے دھتکارتی ہوئی ''دور ہٹ دور ہٹ'' کہتی رہی اور کومل بھی اس کے پیچھے ہنستی مسکراتی دوڑتی رہی۔ دیر تک ساس بہو کی آنکھ مچولی پر جیون داس ہنستا رہا اور پھر دونوں نے زبردستی ماں کو پکڑ کر مٹھائی کھلا دی لیکن وہ تھو تھو کرتی رہی۔ جیون داس کو جب ماں کی ناراضگی کا شدید احساس ہوا تو اس نے فوراً اسے منانے کے لئے دوسرا حربہ استعمال کیا، اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا:

''ماں جی میں آپ کا بیٹا ہوں، بھگوان کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں مجھے غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔'' پھر اس نے ماں کے پاؤں پکڑ کر اپنا چہرہ ان پہ رکھ دیا تو ماں کا دل پسیج گیا، وہ رو اٹھی، اس کے بہتے آنسو دیکھ جیون داس بھی رو پڑا۔ یہ سب منظر دیکھ کر کومل کی آنکھوں میں بھی آنسو اُمڈ آئے۔ پھر معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اسی دوران جیون داس کا باپ واسدیو اپنے کمرے سے باہر نکلا اور اپنے بیٹے کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ باپ کا ناخوشگوار رویہ دیکھ کر جیون داس کچھ دکھی سا ہو گیا۔ اپنے دکھ سے چھٹکارا پانے کے لئے اس نے رات کو تھوڑی سی وسکی پی اور سو گیا۔ واسدیو نے بیوی کو بڑے غصے سے پوچھا:

''تم نے اس شودر کو کیوں گھر میں داخل ہونے دیا، اسے بول کہ گھر چھوڑ کر کہیں دور چلا جا، تا کہ میری نظریں اسے کبھی نہیں دیکھ پائیں۔''

جیون داس کی ماں خاموش رہی، وہ کیا کہتی، وہ خود اندر ہی اندر ٹوٹ گئی تھی اور بھگوان سے اپنی موت کی بھیک مانگ رہی تھی۔ جیون داس ماں باپ کی ناراضگی اور ان کی محدود سوچ پر کافی دکھی تھا۔ وہ سوچ کے اتھاہ سمندر میں ڈوبا ہوا یہ چاہتا کہ تمام ملک کے لوگوں میں ایکتا، بھائی چارے اور خوشحالی کی لہر دوڑ جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ تمام لوگ مذہبوں، دھرموں، ذات پات، چھوت چھات اور ریتی رواجوں کو چھوڑ کر انسانیت کے رنگ میں رنگ جائیں کیوں کہ وہ بھی جانتا تھا کہ دنیا میں انسان کا خون سب سے زیادہ مذہب اور ذات پات کی بنیاد پر بہایا گیا ہے۔ ایک ہفتے تک جیون داس مسلسل بیقراری سی محسوس کرتا رہا۔ وہ لاکھوں لوگوں تک اپنے باغیانہ خیالات و نظریات پہنچانے کا کوئی بہتر موقع تلاش کر رہا تھا کہ اچانک اسے ''ملن میلا'' یاد

آیا کہ جس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی تعداد لاکھوں میں ہوتی۔ اس کے چہرے پر بشاشت کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے مسرت آمیز لہجے میں بیوی سے کہا:

"کومل! ساون کی ۲۱ تاریخ کو ہم "ملن میلے" میں جائیں گے۔ اس میلے میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی بھاری تعداد ہوتی ہے۔ کومل نے پوچھا:

"یہ میلہ کس خوشی میں منایا جاتا ہے؟"

جیون داس نے جواب دیا:

"یہ میلہ تین طرح کے عاشقوں کا میلہ ہوتا ہے۔ ایک وہ جن کی نئی نئی شادی ہوئی ہوتی ہے۔ دوسرے وہ جن کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے اور تیسرے وہ جو اپنے بہار شباب کے دنوں کی یاد تازہ کرنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔"

ساون کی ۲۱ تاریخ کو جیون داس اپنی جیون ساتھی کومل کے ساتھ ملن میلے میں چلا گیا۔ میلے میں لاکھوں لوگ موجود تھے۔ عورتیں، مرد، بوڑھے، نوجوان اور بچے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہ سبھی آج ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور اپنے اپنے مذہبوں، دھرموں، عقیدوں، ذاتوں اور رسموں کو اپنے اپنے گھروا ہی میں چھوڑ آئے ہوں۔ نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی تعداد زیادہ تھی جن کے چہرے خوشی سے کھل رہے تھے یوں معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ اس احساس کی غمازی کر رہے ہوں کہ کب کے بچھڑے کہاں آکے ملے۔

جیون داس نے بیوی سے کہا:

"کومل! آج میں ان لاکھوں لوگوں تک اپنے ترقی پسند خیالات و نظریات پہنچانا چاہتا ہوں۔ تم یہ تو جانتی ہو کہ ہمارے ملک میں بسنے والے لوگ مختلف ذاتوں، مذہبوں، ریتی رواجوں اور مخالف مذہبی نظریات کی بنیاد پر انسانیت کا خون بہاتے ہیں۔ اس لئے آج میں ان کو ایک بہت بڑی بات سناؤں گا تاکہ یہ امن و سلامتی اور ترقی کی زندگی بسر کریں۔"

کومل نے کہا:

"خاموش رہئے، ہم یہاں ملن میلہ دیکھنے آئے ہیں، آپ کیوں اپنی جان کے لئے خطرہ مول رہے ہیں؟"

جیون داس بولا:

"نہیں کومل! مجھے آج اپنے دل کی بھڑاس نکالنے دو۔ میں عوام کو ایک نیا راستہ دکھانا چاہتا ہوں اور اپنے علم کی روشنی سے ان کی زندگی کی تاریک راہوں کو منور کرنا چاہتا ہوں"

جیون داس نے کول کے منع کرنے کے باوجود لوڈ اسپیکر پر تمام لوگوں کو بآواز بلند مخاطب کیا:

"میرے دیش کے لوگو! میرے قریب آؤ، میری بڑی بات سنو، میں آج آپ کو انسانیت اور بھائی چارے کا ایک نیا فارمولا بتانا چاہتا ہوں۔ ہمارا ملک اس فارمولے کے تحت ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا اور ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں میں جو اکثر خوں ریزیاں ہوتی ہیں وہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گی"

جیون داس کی زوردار آواز ہر ایک کے کان میں پڑی اور تمام فرقوں کے لوگ اس کے قریب آنا شروع ہوئے۔ سب میں ایک تجسس پیدا ہوا کہ آخر جیون داس آدمیوں کے اس وسیع وعریض جنگل میں کیا پیغام مسرت سنانا چاہتا ہے! دیکھتے دیکھتے تمام مذہبوں اور دھرموں کے لوگ اس کے سامنے جمع ہو گئے۔ سب کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں، سب کو انتظار اس بات کا تھا کہ آخر جیون داس کہنا کیا چاہتا ہے۔ تھوڑے وقت کے بعد جیون داس نے کہنا شروع کیا:

"میرے دیش میں بسنے والے بھائیو! بہنو اور بزرگو! ہم سب انسان ہیں مگر مختلف فرقوں، ذاتوں اور رسموں رواجوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کوئی اپنے آپ کو ہندو کہتا ہے، کوئی مسلمان، کوئی سکھ، کوئی بدھ اور کوئی جین کہتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت ساری ذاتوں میں ہم بالکل سمٹ کر رہ گئے ہیں۔ ان مذہبوں، دھرموں اور ذاتوں کی بنیاد پر ہم ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ قتل وغارت کا بازار گرم کرتے ہیں۔ ہم نے ان چیزوں کو اتنی اہمیت دے رکھی ہے کہ ہمارا ملک ترقی کے بدلے انتہائی تنزلی کا شکار ہو کے رہ گیا ہے۔ اس لئے اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں امن وامان اور خوشحالی قائم ہو، ہمارا ملک ہر طرح سے ترقی کرے اور ہمیں صحیح زندگی کا لطف حاصل ہو تو اس کے لئے آپ کو میری ایک نصیحت پر عمل کرنا ہوگا۔ وہ یہ کہ آپ تمام دھرموں، مذ ہوں، ذاتوں اور رسموں رواجوں سے اپنا دامن حیات چھڑا لیجیے، آپ کا کوئی بھی دین دھرم نہ ہو نہ کوئی ذات ہو بلکہ آپ صرف انسان بن کے رہیں، کوئی بھی مذہبی پابندی نہ ہو، کیوں کہ مذہبی جنون ہماری تمام آزادیاں ختم کر دیتا ہے۔"

مسلسل بولتے بولتے جیون داس کی زبان بالکل خشک ہوگئی تو اس نے پانی کا گلاس منگوایا اور کھڑے کھڑے غٹ غٹ کر کے پی لیا۔ رتن لعل جو حالیہ اسمبلی انتخابات میں ہار گیا تھا اس نے اپنے نزدیک بیٹھے ایک شخص سے آہستہ سے کہا:

"لگتا ہے سالہ پکا ناستک ہے۔ ہم تو مذہب ہی کے نام پر لوگوں سے ووٹ حاصل کرتے

ہیں اور یہ کہتا ہے دین دھرم ہی چھوڑ دو۔"

جیون داس نے پھر بولنا شروع کیا:

"میرے دیش کے لوگو! انگریزوں کو دیکھو وہ کس طرح پوری دنیا پہ حکومت کر رہے ہیں، اور خوشحال زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی ترقی اور کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ دین دھرم اور ذات پات پہ یقین نہیں رکھتے اور نہ ہی ان میں حرام و حلال کی تمیز ہوتی ہے۔ وہ تو کیڑے مکوڑے جانور یہاں تک کہ سانپ کو بھی مچھلی کی طرح روسٹ کر کے کھا لیتے ہیں جب کہ ہمارے یہاں ایک فرقہ ہر حال میں جھٹکا، دوسرا حلال اور تیسرا حلال اور جھٹکا دونوں کھا لیتا ہے جب کہ انگریزوں میں ایسا کوئی چکر نہیں ہوتا۔ اور پھر ہم ہندوستانیوں کا اپنا کیا ہے؟ ہم نے کون سی ایجادات کی ہیں۔ ہم تو انگریزوں کے نقال ہیں۔ یہ ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ریڈیو، ٹیلی ویژن، بجلی، ریل گاڑی، موبائل فون اور کمپیوٹر یہاں تک کہ یہ جو تمہاری اور میری پینٹ اور اس کی زیپ ہے یہ بھی انگریزوں ہی نے بنائی ہے ورنہ اس سے پہلے تو ہمارے یہاں لنگوٹ ہی پہنا کرتے تھے۔ یہ کتنے بڑے دکھ کی بات ہے کہ ہم اپنے بچوں کو چھوٹی ہی عمر میں ہندو، مسلمان اور سکھ بننے کی تربیت دیتے ہیں۔ گویا ہم انہیں انسان بنانے کی بجائے ہندو، مسلمان اور سکھ بنانا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بچے کو اسکول میں داخل کرنے کے لئے ایک متعینہ عمر رکھی گئی ہے۔ ووٹ ڈالنے کے لئے اور شادی کرنے کے لئے عمریں مقرر ہیں لیکن بچے کو ہم اسی وقت سے ہندو، مسلمان اور سکھ بنانے کی فکر میں لگ جاتے ہیں جب وہ بالکل نابالغ ہوتا ہے۔ ان مسلمانوں ہی کو دیکھ لیجئے، یہ اپنے بچوں کو چار سال کی عمر میں ہی مسلمان بنا لیتے ہیں۔ بچہ چاہے کتنا ہی چیخے چلائے اور منہ بنائے مگر یہ خدا کے پیارے تب تک بچے کی خلاصی نہیں کرتے جب تک اس پہ ختنے کی صورت میں اپنا مسلمانی ٹھپہ نہ لگا ئیں۔ ہندو بچوں کو اگر چہ ختنہ نصیب نہیں ہوتا مگر وہ بھی منڈن اور یگیہ اپدیپ جیسی رسموں کے ذریعے ہندو بنائے جاتے ہیں۔ جب کہ سکھ اپنے جسم کے کسی بھی حصے کے بال کا کاٹنا مہا پاپ سمجھتے ہیں اور بچوں کو چھوٹی ہی عمر میں کرپان اور پگڑی سے متعارف کراتے ہیں"

جیون داس لمحہ بھر کے لئے خاموش ہو گیا تو کمال دین نے اپنے قریب بیٹھے شخص سے آہستہ سے کہا "لگتا ہے یہ انگریزوں کا ایجنٹ ہے۔"

جیون داس نے اپنے باغیانہ خیالات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا:

"میرے دیش کے لوگو! آخر تم کب تک ان رسموں، رواجوں اور عقیدوں کے لئے اپنی

ترقی اور خوشحالی کے راستے مسدود کرتے رہو گے؟ اس لیے میرا آپ کو یہی مشورہ ہے کہ انگریزوں کا طرزِ زندگی اپنالو اور خوشحال زندگی جیو، کیوں کہ انگریزوں کا کوئی دین دھرم نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ تمہاری طرح رسموں اور رواجوں کی پرواہ کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آزاد اور ترقی یافتہ ہیں"

زیندر سنگھ نے اپنی پگڑی درست کرتے ہوئے آہستہ سے اپنے قریب بیٹھے ایک شخص سے کہا:

"لگتا ہے اس سالے کا دماغ خراب ہو گیا ہے تبھی یہ ایسی باتیں کرتا ہے۔"

جیون داس کا بھاشن سنتے سنتے جب ہندو، مسلمان اور سکھ فرقے کے لوگ تھک گئے تو انہوں نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لینا شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے لاکھوں لوگوں کا مجمع غائب ہو گیا، کسی میں بھی جیون داس کے باغیانہ خیالات کا منہ توڑ جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان کی خاموشی جیسے یہ ظاہر کر رہی تھی کہ انہیں جیون داس کے تمام باغیانہ نظریات سے کوئی بھی اختلاف نہیں ہے۔

جیون داس نے جب یہ دیکھا کہ تمام فرقوں کے لوگ بغیر کسی احتجاج کے اپنے اپنے گھروں کی طرف جا رہے ہیں تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈ میں پنجابی گانے کی کیسٹ فٹ کی اور دور دور تک لاؤڈ اسپیکر پر اس گانے کی آواز گونجنے لگی:

"کھاؤ پیو عشق کرو متر و دِل پر کسے دا دُکھائیو نئیں"

اب جیون داس اس گانے کی دھن پر چند نوجوانوں کے ساتھ ناچ رہا تھا اور کچھ ہی لمحوں بعد اس کی بیوی کومل بھی ناچنے لگی۔

○○

شمیم قاسمی: دیہی لفظیات اور متعلقہ ثقافت کا شاعر

وہاب اشرفی

شمیم قاسمی نئے شاعر نہیں۔ ان کا شعری سفر ۱۹۷۰ء کے آس پاس شروع ہوا۔ گویا وہ ۳۵، ۳۶ برس سے شاعری کی تخلیقی جوت جگاتے رہے ہیں۔ ان کے مجموعے "گمشدہ موسم" اور "اڑان کا موسم" لوگوں کی نظر میں ہیں۔ کئی مضامین بھی ان مجموعوں کے سلسلے میں لکھے گئے ہیں اور معتبر ناقدوں نے بھی ان پر توجہ کی ہے۔ دراصل شمیم قاسمی بھیڑ کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کی غزلوں کا مزاج و منہاج کچھ الگ سا ہے۔

اس وقت ان کے نئے مجموعے "پابرہنہ" (زیر اشاعت) کی کچھ غزلیں میرے پیش نظر ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف اپنی اگلی روش پر قائم ہیں اور انہوں نے جس طرح اپنی شعریات مرتب کی تھی اس کی تجدید کرتے نظر آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انہوں نے شعروادب کے بارے میں کیا کچھ سوچ رکھا ہے؟ اس کی ایک جھلک ان کے تمام شعری مجموعوں کے پڑھنے والوں کے سامنے ہونی چاہئے۔ انہوں نے "پابرہنہ" ہی کے ابتدائی صفحات اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ چند نکات میں پیش کر رہا ہوں:

(۱) آگ میں جھلستے دھواں دھواں سے منافقانہ ادبی ماحول میں بھی انسانی زندگی کی اعلیٰ اقدار، وراثتی سرمایوں اور اس کے متعلقات کی بقا کے لئے ایک قابل ذکر تعداد میں اہل قلم حضرات کی جدوجہد جاری ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتو پھر کوئی ادبی فن پارہ نہ صرف ادھورا رہ جائے گا بلکہ اصولاً بے معنی اور بے وقعت بھی۔

(۲) شکر ہے کہ اب میں تخلیقی اظہار کی ایک غیر مشروط اور کشادہ فضا میں اڑانیں بھر رہا ہوں اور تا حد نظر بکھرے کائناتی مظاہر و مناظر کے زیر اثر رہ کر انسانی حیات کے نت نئے مسائل کو دیکھنے، محسوس کرنے اور برتنے کا آزادانہ طور پر حوصلہ جٹا رہا ہوں۔

(۳) ابھی میں اپنے عہد کی سفاکیوں اور مشکوک ادبی فضا سے بدظن نہیں ہوا ہوں۔

(۴) اردو چونکہ میری مادری زبان ہے اس لئے مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے اور میری زندگی کی ناکامیوں کی وضاحت کے لئے مضبوط وسیلۂ اظہار بھی۔ اب معاملہ کچھ یوں ہے کہ لاشعوری طور پر شعر و ادب سے میرا ذہنی رشتہ کسی بالیکا کی گندھی ہوئی چوٹی جیسا ہو گیا ہے۔

(۵) ''گمشدہ موسم'' (۱۹۸۴ء) کے اوراق پر ''شاعری میرے لئے ایک روگ'' کے عنوان سے میں نے اپنے اس جی کی جنجال یعنی اپنی شاعرانہ وحشتوں کے اسباب اور اپنے شعری نقطۂ نظر کی تفصیلی وضاحت کرتے ہوئے اس کا اعتراف کیا تھا کہ غزل لاکھ نیم وحشی صنف سخن ہو یا ایام جاہلیت یا بیکاری کی دین سہی، یہ میرے تخلیقی سفر کا پاورفل استعارہ ہے۔ مجھے اس کا اعتراف کرنے میں مضائقہ نہیں کہ زندگی کے بے رنگ موسموں میں بھی غزل میری سویٹ ڈارلنگ (Sweet Darling) رہی ہے کہ یہ کسی خوبصورت محبوبہ کی طرح بے وفا تو نہیں۔

(۶) یہ میری بالکل نجی سوچ ہے کہ صنف غزل اس خوبرو اور صحتمند عورت سے مشابہ ہے جو بے دریغ خرچ ہوتی رہی ہے..... اس کا فرحسینہ کو الٹ پلٹ کر، گھما پھرا کر یعنی اپنے شعری ذوق کے مطابق جتنا بھی استعمال کیا جائے اس کے جمال کی دوشیزگی میں اتنا ہی نکھار آئے گا۔

گویا شمیم قاسمی منافقانہ ادبی ماحول سے خائف نہیں بلکہ زندگی کی ارفع قدروں اور سرمایوں کی بقا کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ ایسے ماحول میں جد و جہد کی فضا جاری رہے اور شعر و شاعری کی آبیاری ہوتی رہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ اب تخلیقی اظہار کی ایک غیر مشروط فضا میں سانس لے رہے ہیں اس طرح کہ اب وہ نئے مسائل کو آزادانہ طور پر دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ اس عہد کی سفاکیاں اپنی جگہ پر لیکن ادبی فضا ان کی نگاہ میں وہ ہونا چاہئے جو ایسی سفاکیوں سے خائف نہ ہو، وہ اس پر بھی اصرار کرتے نظر آتے ہیں کہ اردو ان کی مادری زبان ہے لہذا وہ اپنی جان سے زیادہ اسے عزیز رکھتے ہیں، اس حوالے سے وہ شعور اور لاشعور تک پہنچتے ہیں۔

یہ مباحث وہ ہیں جو تازہ بکار ہیں اور خالق کے ذہن کی وسعت کا اظہار کر رہے ہیں۔ موصوف غزل کی نیم وحشیانہ صورت پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس پر زور دیتے ہیں کہ ان کے تخلیقی سفر کا بیحد مضبوط استعارہ غزل ہی ہے۔ وہ اسے سویٹ ڈارلنگ کہتے ہیں جو ہرگز بے وفا

نہیں ہے۔ مزید اس پر استدلال کرتے ہوئے وہ اسے خوبرو اور صحتمند عورت کے مشابہ قرار دیتے ہیں جو خرچ ہونے کے باوجود اپنی دوشیزگی زائل ہونے نہیں دیتی۔ شمیم قاسمی کے یہ بیانات ان کے ذہن ودماغ کی تفہیم میں بیحد معاون ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ، غزل کے جس جمالی کیف کا اظہار کرتے رہے ہیں وہ ان کی شاعری میں بھی نمو پذیر ہوتی رہی ہے۔ ویسے یہ بھی ہے کہ لفظوں کی حرمت کا احساس رکھتے ہوئے وہ ان الفاظ کو بھی رد نہیں کرتے جو بظاہر غزل کے عمومی مزاج سے لگا نہیں کھاتے۔ لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ خالق کا ذہن، اس کا وژن (Vision) اور اسکی بصیرت بعض متروک الفاظ کو بھی حرمت عطا کر دیتے ہیں، اور یہ کام شمیم قاسمی نے خوب کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ الفاظ سے کھیلتے رہے ہیں اور بڑی آسانی سے اس کھیل کو شاعرانہ وصف عطا کرتے رہے ہیں۔ کیا یہ ایک اضطراری بیان ہے تو کچھ آرا کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

شمس الرحمٰن فاروقی ان کی غزل گوئی کے سلسلے میں ایک بیان دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غزل کی زبان کو کتابی اور مکتبی اثر سے آزاد کرنے کی کوششیں پہلے بھی ہوئی ہیں اور آج بھی ہو رہی ہیں۔ زبان کا ارتقا اسی طرح ہوتا ہے۔ محمد علی صدیقی نے لکھا ہے کہ شعری زبان کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اپنی لغت میں نہ صرف ہمہ اقسام کی تبدیلیوں کی اجازت دیتی ہے بلکہ تبدیلیوں ہی کو حیات شاعری سمجھتی ہے۔

گوپی چند نارنگ کی رائے ہے کہ زبان میں خالص پن صرف مثالی تصور ہے...... اصل چیز اس کی وہ تخلیقیت ہے جو جادو کا اثر پیدا کرتی ہے۔ یہ سارے لوگ دراصل اس عمومی تبدیلی کا ذکر کر رہے ہیں جو لفظوں کی حد تک شمیم قاسمی کا بھی تخلیقی میلان رہا ہے۔ یہ ہے بیحد مشکل کام۔ دراصل وہ الفاظ جو بظاہر ٹھیٹ معلوم ہوتے ہیں ان میں نیرنگی پیدا کرنا اور غزل کی نازک مزاجی سے آمیز رہا کرنا ایک مشکل امر ہے۔ شہاب ظفر اعظمی کی یہ رائے قوی معلوم ہوتی ہے کہ ''شمیم قاسمی نے اشیا اور خاص طور پر دور افتادہ چیزوں کے درمیان مماثلت تلاش کرنے یا انہیں ناموزوں رشتے میں جوڑنے کے ساتھ ساتھ غیر معمولی، اجنبی، ان مل، بے جوڑ...... یہاں تک کہ متروک الفاظ برت کر بھی لفظ و معنی کے لئے تازہ اور بھرپور امکانات دریافت کئے ہیں۔ غرض کہ نئے ہوں کہ پرانے لکھنے والے سبھوں کو یہ احساس ہے کہ شمیم قاسمی کا ڈکشن کچھ مختلف سا ہے اور یہ ڈکشن بہت سوچ سمجھ کر ایک مخصوص تیور کے ساتھ اختیار کیا گیا ہے۔ چند شعر دیکھئے:

خوشنما لفظ کے ٹاپو سے نکل صوت و آہنگ کے جادو سے نکل

جس ہی جس ہے تنبو سے نکل — دیکھ آزادی بڑی نعمت ہے

زور بازو ہو تو چپو سے نکل — کشتی جسم کو ساحل تو ملے

غور فرمائیے، ٹاپو، تنبو اور چپو ایسے الفاظ ہیں جو بظاہر جمالی کیف سے دور معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر متعلقہ اشعار میں ان کے استعمال اور ان کی تخلیقیت کا تجزیہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ یہ تو اپنی دیہی خوبو سے الگ ہو کر نئے رنگ و روغن اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ایک دوسری غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نقص جو شعر ور سے نکلا — لفظ کے ہیر پھیر سے نکلا

حسن خودسر اندھیر سے نکلا — رنگ بازار پڑ گیا پھیکا

شوق لیکن بٹیر سے نکلا — ہم کہ سرخاب کے شکاری تھے

خار و خس کے ہی ڈھیر سے نکلا — جوہر شاعری جو لفظ بنا

میرے خیال میں یہ خار وخس کے ڈھیر سے نکلے ہوئے الفاظ نہیں، بلکہ اپنی ایک ثقافتی زندگی رکھتے ہیں۔ اس زندگی کی تجدید شمیم قاسمی بطریق احسن کرتے نظر آتے ہیں۔ غزل کے تعلق سے ان کا ایک شعر ہے:

غزل کے ناز نخرے سہہ رہا ہوں
تو سمجھو چین سے میں رہ رہا ہوں

یہاں ناز نخرہ اس بیوی کا نہیں ہے جو شاعر لاشعور میں تقابلی کیفیت سے گزر رہا ہے۔ یہ تو غزل کے Challenges سے ٹکرانا ہے اور یہی شاعر کی زندگی بھی ہے۔ گویا یہاں اس صنف کی عظمت کو سمیٹ لینے کی کوشش کی گئی ہے اور اپنی وابستگی کو واضح کیا گیا ہے۔ اسی قبیل کا ایک شعر اور دیکھئے:

سخن شناس قلم نے بنایا دل آویز — سپاٹ کھردرے الفاظ کی بڑی قیمت

یہاں کھردرے الفاظ کس طرح شاعر کے برتاؤ سے تازہ بکار ہو کر خوش آہنگ ہوئے ہیں، ان کی ایک تصویر پیش کی گئی ہے۔ مزید ایک شعر اور دیکھئے:

بارش میں، میں اولتی کے نیچے پڑا رہا — دروازۂ خیال کو کھلنا تھا نہ کھلا

مجھے کہیں دوسری جگہ بھی شعری برتاؤ میں اولتی کا لفظ نہیں ملا۔ لیکن یہاں شاعری کے تخلیقی

جوہر نے نہ صرف اسے قابل لحاظ بنایا ہے بلکہ اسے خوش آہنگ بنا کر نئی معنویت سے آشکار کر دیا ہے۔اسی زمرے کے کچھ اور اشعار پیش ہیں:

میں پا برہنہ ہوا محو رقص بانا جب
تو دانت کھٹے کر دیئے کھٹے تمام دشمن کے

کیا خوف کہ ہے چاند سے ہر چیز منور
ہے کھیت میں بویا ہوا ارہر بھی مری جان

غرض کہ شمیم قاسمی کے یہاں ایک طرح کی نئی تخم ریزی ہے جو ایسی فصل پیدا کرتی ہے جو کئی طرح کی سرشاری عطا کرتی ہے اور احساس جمال کی بعض منزلوں تک رسائی کی جہت بھی بنتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسے کچھ الفاظ کی فہرست دے دوں، تو دیکھئے، تنکی سی ٹھس، کڑکی، تلی، چسکی، ارہر، عین، غین، بلریز، مسی، نکھٹو، چچھی، بالو، جھٹ پٹ، بٹیر، بھیڑ بھڑ کا، کھینی، چلبل، چڑیل، نونی وغیرہ۔ یہ تمام الفاظ مختلف اشعار سے لئے گئے ہیں۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں چند ایسے ہیں جو شاید ہی صنف غزل میں استعمال ہوئے ہوں۔ بعض کہہ سکتے ہیں کہ بہاریوں کے لئے ایسے الفاظ نئے نہیں ہیں اور وہ ان کے مزاج و منہاج سے آگاہ ہیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ شاعری کسی متعینہ ثقافت کی سند بھی ہوتی ہے۔ مجھے احساس ہوتا ہے کہ بہار کی آب و ہوا، اس کا رنگ، اس کا کیف، اس کے کھیت کھلیان، اس کے لوگ باگ، اس کی بولی ٹھولی، محاورے وغیرہ کا کوئی رخ بھی کوئی شاعر بطریق احسن پیش کرتا ہے تو گویا وہ شاعری کی عام فضا میں اپنی صلابت تہذیب کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ کام شمیم قاسمی اپنے کلام سے خوب خوب لیتے ہیں۔ یہی ان کا اختصاص ہے جو انہیں اپنے معاصرین سے الگ کرتا ہے۔

شمیم قاسمی کی فکری دنیا کچھ الگ نہیں ہے، زمانہ کیا ہے؟ حالات کیسے ہیں؟ دوست احباب کا کیا حال ہے؟ قدروں کی شکستگی کی کیا روش ہے؟ عشق و محبت کے کیف اور مزاج پہلے کیا تھا اور اب کیا ہے؟ علاقائی مسائل کیا ہیں اور گلوبل کیسا ہے؟ یہ سارے موضوعات کہیں نہ کہیں موصوف کی شاعری میں برتے گئے ہیں۔ میں ان تمام پہلوؤں پر اشعار قلم بند نہیں کروں گا۔ مشتے نمونہ از خروارے ایک غزل کے اشعار دیکھئے:

مسی سے اور سرمہ و کاکل سے کیا میاں
گلشن ہی جب نہیں ہے تو پھر گل سے کیا میاں

بارود کی بدن سے بہت پھوٹتی ہے بو
آئے ہو تم ابھی ابھی کابل سے کیا میاں
ناآشنا اشارۂ ابرو سے ہے بہت
خوابیدہ جسم جاگے کا چلبل سے کیا میاں

دراصل مسی، سرمہ اور کاکل یہ سارے لوازمات زیب اسی وقت دیں گے جب اس کے لئے ویسی شخصیت ہوگی، اگروہی عنقا ہے تو پھر یہ آرائش کیسی اور کس کے لئے؟ گل تو گلشن سے عبارت ہے اور جب گل کا وجود ہی نہیں تو گلشن کے بارے میں کیا کہا جائے؟ اگر اس کی وسیع معنویت تلاش کی جائے تو محسوس ہوگا کہ آج کی خارزار زندگی میں ہر وہ چیز جو نازک اور خوبصورت ہے اس کی معنویت گم سی ہوگئی ہے۔

دوسرے شعر گلوبل سچویشن (Global situation) پیش کر رہا ہے۔ بارود کا بدن اور کابل سے کیا رشتہ ہے اس کی تفصیل پیش کرنا مقصود نہیں، لیکن آج کے ایٹمی دور میں انسانی شخصیتوں، ذاتی یا اجتماعی ملکوں، قوموں وغیرہ کی کیا صورت ہے؟ اس کی تصویر اشارے کنائے میں پیش کر دی گئی ہے۔ بارود دراصل ایٹمی توانائی کی منفی کیفیت کا اشاریہ ہے جو غزل کے محض ایک شعر سے نمایاں ہے اور آخری شعر غزل کے اس عمومی مزاج سے ہم آہنگ ہے جسے حسن و جمال کا کیف کہا جاتا ہے۔ محبوب کا چلبلا پن معروف ہے، لیکن یہاں شاعر کو ایک ایسی کیفیت سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ اشارۂ ابرو سے وہ نا آشنا ہے، اس کا چلبلا پن اس کے خوابیدہ جسم کو جگا نہیں سکتا۔ گویا یہاں عمر کی ایک خاص منزل سے بھی آشنائی ہوئی ہے، جہاں کوئی جنسی ترغیب تحریک نہیں پیدا کرتی، جب تک اس باب میں کوئی ایسی روش نہ اپنائی جائے جو زیادہ موثر ہو۔

کہہ سکتے ہیں کہ شمیم قاسمی اردو شاعری کی شاہراہ پر پابرہنہ چل رہے ہیں۔ موصوف نئی لسانی تشکیلات کے شاعر نہیں، ان کے یہاں تجربے کے نام پر لفظوں کے توڑ پھوڑ کا عمل نہیں ملتا بلکہ دیہی زندگی کے وہ الفاظ جو 'مہذب' استعمال سے دور ہو گئے ہیں، کے استعمال پر زور ملتا ہے۔ گویا یہ لسانی رویہ خلاقانہ ہے جو دیہی ثقافت کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے اور متعلقہ ثقافت کو زندہ بھی کرتا ہے۔

○○

زندگی کی ناہمواریوں کا مفکر شاعر: عطا عابدی

وہاب اشرفی

عطا عابدی کی دو حیثیتیں ہیں بلکہ اگر تین کہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں پھر صحافی اور اس کے بعد ایڈمنسٹریٹر۔ یہ تینوں پہلو ان کی شاعری پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ ''نوشت نوا'' میرے پیش نظر ہے لیکن یہ پہلا مجموعہ کلام نہیں ہے۔ اس سے پہلے انہوں نے 'مطالعے سے آگے'، 'بیاض'، 'افکار عقیدت' مجموعہ شاعری شائع کیے ہیں۔ گویا ان کی شاعری سے لوگ بخوبی متعارف ہیں لیکن 'نوشت نوا' کی نوعیت کچھ مختلف ہے اور یہ صورت اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ:

جب قلم ہاتھ میں آیا تو عطاؔ ایسا لگا
اک ملاقات زمانے سے زمانے کی ہوئی

نئے شاعروں نے غزل میں بہت سے نئے تیور پیدا کیے ہیں جو ان کے فکروفن کے بہت سے صفات اور امتیازات کو روشن کرتے ہیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عطا عابدی اپنے زمانے سے آنکھیں لڑا رہے ہیں۔ دنیا ہو کہ دین دونوں ہی جہات میں ان کے ہیجان کا اندازہ ملتا ہے۔ وہ اس بھری پری دنیا میں آہستہ آہستہ اور سے اور پرسکون طریقے سے گزرنے والے نہیں، ان کی راہ میں کانٹے بچھے ہوئے ہیں اور یہ کانٹے وہ ہیں جو زندگی اور سماج کی ناہمواریوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ تہذیب اور تمدن کے زوال کی بہت سی نشانیاں ان کے ذہن کو ہیجان اور انتشار میں مبتلا کرتی ہیں:

گھروں میں یوں اجالا ہو گیا ہے
اک اک ذرہ شرارہ ہو گیا ہے
ہوا گھر رشک گلشن باغباں کا
چمن کا رنگ پھیکا ہو گیا ہے

یہ صورت ہے جوان کے مرکزی تصور کی کلید ہے اور یہ کلید انہیں ہر موقع پر، زندگی کے بہت سے معاملات میں تشکیک میں بتلا کر دیتی ہے، سارے مثبت پہلو شک وشبہ کی زد میں آجاتے ہیں:

وقت نے یوں لکھا ہے امتحاں ہتھیلی پر
ہم ہمیشہ رکھتے ہیں اپنی جاں ہتھیلی پر

عطاؔ دیکھو قیامت آگئی کیا
یہ دنیا میرے سرہانے کھڑا ہے

لیکن عطا عابدی کی یہ دنیا، جوان کے سرہانے کھڑی ہے، سکون بخش نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ موصوف اس زندگی سے بیزار ہیں بلکہ ان کے یہاں تکمیلیت کی تلاش ہے اور جب ایسی تکمیلیت انہیں حاصل نہیں ہوتی تو ان کا حساس دل شکستہ ہو جاتا ہے:

اگر تیرا نہیں کس کا ہوا ہوں
میں اپنے آپ سے الجھا ہوا ہوں

یہ کیفیت بافکر لازمی عنصر کی طرح ابھرتی ہے جوان کی شاعری کے خدوخال کو نمایاں کرتی ہے۔ یعنی کشمکش میں ایک طرح کا تحرک پیدا ہو جاتا ہے اور اس تحرک سے نئے شعری نشانات پیدا ہوتے ہیں:

حقائق اب ہوئے ہیں جا کے روشن
میں خوابوں کی طرح ٹوٹا ہوا ہوں

مجھے کہنے دیجئے عطا عابدی وجودیت پسند نہیں ہیں۔ انہیں مارٹن، سپرس، مارسل، کافکا یا دوسرے ایسے فنکار جو زندگی کی لایعنیت کو مرکزی حیثیت دیتے ہیں ان کے ساتھ نہیں، بلکہ وہ ٹوٹی الجھی ہوئی دنیا کے شارح بن گئے ہیں اور ان کی شرح میں ان کی اپنی شرح حیات سے زیادہ دنیا کے مزاج اور میلان کا پتہ ملتا ہے:

بہت آگے گئی دنیا مگر میں
جہاں کل تھا وہیں ٹھہرا ہوا ہوں
مری ہستی ہے برگِ خشک گویا
نفس کی آنچ پہ رکھا ہوا ہوں

ایسی کیفیات سے گزرنے والا شاعر اپنے ہیجان کو کبھی ایک کروٹ نہیں لگا سکتا، ہاں اس سے شعری جوت جگا سکتا ہے جو عابدی کرتے ہیں۔ لیکن یہ احساس ہے کہ ایسی فکری اساس سے کتھارسس کا عمل ملتا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں:

بہت ہی قیمتی تھی زندگانی
یہ جانا زندگی قربان کر کے

گویا عطا عابدی زندگی کو لایعنی نہیں سمجھتے۔ لیکن اس کے مثبت پہلوؤں کی تلاش بھی ان کا مطمح نظر نہیں۔ سچ ہے کہ اچھا فنکار حالات پر نظر رکھتا ہے اور اس کے قلب و جگر پر جو کچھ گزرتی ہے، اسے اپنا سرمایہ بنالیتا ہے۔ ضروری نہیں کہ سرمایہ سبھوں کے لئے یکساں طور پر متاثر کن ہو۔ شاعر کو اس سے غرض بھی نہیں۔ اگر شاعری تناؤ اور ٹنشن کو دور کرتی ہے تو یہ عمل عطا عابدی کے یہاں مسلسل ملتا ہے۔

ادھر ''پانی'' کی ردیف میں کئی غزلیں مجھے پڑھنے کو ملیں اور مجھے مختلف شعرا کے اظہارات یعنی شاعرانہ اظہارات کی جمالی کیفیت کا احساس ہوا، ہر شاعر نے اس زمین میں یا اس ردیف میں اچھے شعر کہے لیکن غزل تو فکر وفن کے اعتبار سے لامتناہی ہوتی ہے۔ اس کی معنوی حد کہیں ختم نہیں ہوتی اور لگتا ہے کہ قدرت نے خیالات کے لئے اسے الاسٹک بنا کر اسے لافانی بنادیا ہے۔ اس وقت مختلف لوگوں کی متعلقہ غزلیں میرے پیش نظر نہیں ہیں لیکن میں عطا عابدی کے چند شعر نقل کرتا ہوں:

خاک اڑتی ہے ہر اک چہرے پر
کس کی آنکھوں سے نکالوں پانی
دھوپ دریا پہ نظر رکھتی ہے
تجھ کو کوزے میں چھپالوں پانی
روز بچوں کو سلادوں یونہی
روز پتھر کو ابالوں پانی

غور کیجئے۔ پہلے شعر میں ہر اک چہرے پر شاعر کو خاک اڑتی دکھائی دیتی ہے، ایسے میں ان کی خواہش ہے اور شدید ہے کہ چہرہ شاداب ہوتا، اس کی شادابی سے پوری شخصیت تابناک ہو جاتی لیکن اب کس کے حصے کی کوئی چیز اسے دے دی جائے کہ یہ صورت پیدا ہو، یہ ممکن نہیں ہے لہذا خاک اڑتی ہی رہے گی۔ دوسرے شعر میں تو معنی کی وسعت کو اس طرح سمیٹ لینے کی کوشش کی گئی ہے جس کی مثال ملے گی لیکن بہت کم۔ بڑی سادگی سے کہا ہے کہ دھوپ دریا پہ نظر رکھتی ہے، ایسے میں پانی کو کس طرح کوزے میں چھپایا جائے۔ یہ شعر ہر بدنیتی پر دال ہے، ہر ایسا سرمایہ جو محترم اور مکرم ہو اس پر نظر بد ہوتی ہی ہے۔ شاعر کو پانی کی عظمت کا احساس ہے۔ اسے خوف ہے کہ ایسا نہ ہو کہ یہ بھی دھوپ کی نذر ہو جائے۔ یہاں دھوپ ہر اس بلا کا اشاریہ ہے جو قابل لحاظ اور اہم چیزوں کو نرغے میں لے کر اسے ختم کر دیتی ہے۔ شاعر کے یہاں عظمتوں کو محفوظ رکھنے کا ایک نظریہ ملتا ہے جو ہر لحاظ سے مثبت ہے۔ لیکن یہ شعر کسی ایک معنی کی حدوں میں نہیں ہے اور اچھی غزلوں کے حوالے کا ایک شعر ہے۔

کہہ سکتے ہیں کہ عطا عابدی کا مزاج متنوع ہے اور وہ دنیا کی خرافات سے رنجیدہ ہونے کے باوجود نفی کی شاعر نہیں بنتے نہ زندگی کی لایعنیت کا کوئی عذر پیش کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عطا عابدی کے فکر و فن میں تتبع اور نقل کی کوئی صورت نہیں ہے بلکہ ان کا ہیجان ذاتی ہے اور یہی ذاتی کرب مختلف سمتیں اختیار کرتی ہے اور زندگی کی ناہمواریوں کی تصویریں شعری کیف میں ڈھل جاتی ہیں۔ یہی موصوف کا اختصاص ہے جس کے ہر پہلو پر تفصیل سے گفتگو ہو سکتی ہے۔

لاکھ طوفان ہو سوتے ہی نہیں
زندگی ہم تجھے کھوتے ہی نہیں
خامشی اپنی ہے گویا جیسے
کان دیوار کے ہوتے ہی نہیں

○○

غزلیں

شمیم قاسمی

پا برہنہ ہیں ریگ ساگر میں
جانے آگے ہے کیا مقدر میں
سوچنے وجہ کائنات ہے کیا
رمز کیا جانئے گا پل بھر میں
دل حویلی تو ڈھ گئی ہے مگر
عکس محبوب ہے کبوتر میں
اس کے ہونٹوں کا ہے اثر شاید!
یہ جو تھوڑا نمک ہے پتھر میں
اک تصور بھی گھر کا رکھتے ہیں
اور رہتے نہیں ہیں ہم گھر میں
دن ہے چھٹی کا اور خواہش ہے
جان آئے مرے کوارٹر میں!
اپنے سر پر بٹھا رہے ہو تم!
اور دنیا ہے میری ٹھوکر میں

غزل کے ناز نخرے سہہ رہا ہوں
نہ سمجھو چین سے میں رہ رہا ہوں
بظاہر ہو رہا ہوں میں مکمل!
مگر اندر ہی اندر ڈھ رہا ہوں
فقط یوں ہی نہیں آب رواں ہوں
میں اس کی سوچ میں بھی بہہ رہا ہوں
جہاں رکنا نہیں تھا رک کے دیکھا
جہاں رہنا نہیں تھا رہ رہا ہوں
ندی میں ٹھوس پتھر بن کے ابھرا
مگر مانند تنکا بہہ رہا ہوں
سلیقے سے لیا بوسہ کسی کا
سلیقے سے غزل بھی کہہ رہا ہوں

○○

غزلیں

شمیم قاسمی

مری غزل کو بناؤ سنگھار سے پرہیز
میں ایک شاعر آوارہ کب ہوا رنگریز
سپاٹ کھردرے الفاظ کی بڑھی قیمت
سخن شناس قلم نے بنایا دل آویز
وہ آنے والے ہیں مہدی رچا کے پاؤں میں
مہکنے والی ہے تھوڑی ہی دیر میں بلریز
وہ بولتے ہیں تو الفاظ گھولتے ہیں رس
سماعتوں کا اب حصہ ہے موسم گل ریز
نکال لیتے ہیں بس درمیان سے رستہ
سخن سفر میں نہ دھیما ہے اور نہ لہجہ تیز

خوشنما لفظ کے ٹاپو سے نکل
صوت و آہنگ کے جادو سے نکل
ڈھونڈ تخلیق نمو کی قوت
چھوڑ مٹی کبھی بالو سے نکل
قبضۂ دیو میں رہتی ہے پری
اے مرے جن ذرا چاقو سے نکل
خود پسندی کی تلافی کر لے
یعنی تکرار من و تو سے نکل
دیکھ آزادی بڑی نعمت ہے
حبس ہی حبس ہے تنبو سے نکل
کشتی جسم کو ساحل تو ملے
زور بازو ہو تو چپو سے نکل
آج کمرے میں نہیں ہے کوئی
روبہ رو آ مرے پہلو سے نکل

○○

غزلیں

شمیم قاسمی

لفظ کے ہیر پھیر سے نکلا
نقص جو شعر ویر سے نکلا

خوب مہکا مرا گل خود رو
یہ الگ بات دیر سے نکلا

چاند ڈوبا اسی حویلی میں
جانے پھر کس منڈیر سے نکلا

رنگ بازار پڑ گیا پھیکا!
حسن خود سر اندھیر سے نکلا

ہم کہ سر خاب کے شکاری تھے
شوق لیکن بٹیر سے نکلا

فالتو خون کو نکلنا تھا!
دیر سے یا بدیر سے نکلا

ہے عیاں کچھ تو کیفیت دل کی
گرچہ مطلب نہ شعر سے نکلا

جوہر شاعری جو لفظ بنا
خار و خس کے ہی ڈھیر سے نکلا

ہوا تماشا دکھائے گی آج بن ٹھن کے
پھوار پڑنے لگی ہے بغیر ساون کے

بس پا برہنہ ہوا محو رقص بانا جب
تو دانت کر دیے کھٹے تمام دشمن کے

ذرا سا گرتا تو پھر دل کا سبزہ جل جاتا
بنا کے اوک لیا روک اشک ساجن کے

مزاج پریوں کا صورت چڑیل کی جن کی
ہجوم ناز میں آئیں ہیں وہ بھی بن ٹھن کے

وہ چاہتا ہے نشیمن پہ روز برق گرے
مجھے قبول کہ تنکے چنوں نشیمن کے

○○

غزلیں

شمیم قاسمی

یہ گستاخی بھی دل کے چور نے کی
رسیلے لب زباں سے بورنے کی
وہ محو رقص تھا کہ پاؤں الجھے
عجب حالت میاں تب مور نے کی
وہ جب انگڑائی لے پوریں بجائے
ضرورت ہے اسے جھنجھورنے کی
ردائے خامشی میں تان بھی لوں
اسے عادت پڑی ہے شور نے کی
مری تعریف کے پل باندھتا ہے
یہ سازش ہے مجھے درگور نے کی
میں کھونٹے سے کہاں بندھنے کو تھا پر
یہ درگت میری اک کمزور نے کی
نہیں ہے کیفیت پھر بھی غزل ہے
یہی تو بات ہے بس غور نے کی

مسی سے اور سرمہ و کاکل سے کیا میاں
گلشن ہی جب نہیں ہے تو پھر گل سے کیا میاں
بارود کی بدن سے بہت پھوٹتی ہے بو
آئے ہو تم ابھی ابھی کابل سے کیا میاں
بس دیکھنے کی چیز ہے دیوار صحن دل
معمار سنگ و خشت کو ساحل سے کیا میاں
مانا کے پا برہنہ سفر ہے جنون میں
جمنا میں کود جاؤ گے تم پل سے کیا میاں
زندان میں رہے کہ رہے خواب گاہ میں
صیاد دل کو نالۂ بلبل سے کیا میاں
ناآشنا اشارہ ابرو سے ہے بہت
خوابیدہ جسم جاگے کا چلبل سے کیا میاں
یہ کیا گلے میں لقمۂ تر بھی اٹک گیا
لیتے ہو کام طرز تغافل سے کیا میاں

○○

غزلیں

شمیم قاسمی

تیر سڈول سا کمان میں رکھ
ادھ کھلا جسم بھی دھیان میں رکھ
لفظ کا پل صراط بننے تک
حرف سب حیطۂ بیان میں رکھ
ہجرت ارض تو مقدر ہے
نقشۂ خواب آسمان میں رکھ
دیکھ دلدل سوار آیا ہے
چشم گریاں نکال خوان میں رکھ
اک ذرا انتظار گل کر لے
بیج تو سینۂ چٹان میں رکھ
دل میں دل ڈالنے سے کیا ہوگا
شرط ہے جان کو امان میں رکھ
فتح جشن چراغ روشن کر
طبل شاہی کو سر میں تان میں رکھ
خواہش بال و پر سے آگے جا
گرمی جہد بس اڑان میں رکھ

ہمراہ چل رہا تھا کہ تکرار ہوگئی
پھر اس کے میرے بیچ میں دیوار ہوگئی
آندھی چلی تو ذہن میں نو نی جھڑی بہت
دیوار عہد ساز پھر مسمار ہو گئی
پروا بہی تو چٹی تپک ضرب دے گئی
خنجر بدن سے زنگ چھٹا دھار ہو گئی
اک چھو سے شہر یار کا منظر بدل گیا
اک ہو سے جو کٹھن تھی گھڑی پار ہو گئی
ایسا ہوا کہ ساری خدائی مجھے ملی!
ایسا ہوا یہیں پہ مری ہار ہو گئی
وہ تمکنت وہ شوخی شرارت نہیں گئی
کچھ دیر کو غزل مری بیمار ہو گئی

○○

غزلیں

عطا عابدی

سانسوں کے تعاقب میں حیران ملی دنیا
تصویر بنے جب ہم آئینہ ہوئی دنیا

ہم خون پسینہ جب اک کر کے ہوئے روشن
کیوں آگ بنی دنیا اور خوب جلی دنیا

اب اپنا نظریہ کیا، محروم نظر ہیں جب
اس سمت چلے ہم بھی جس سمت چلی دنیا

سیلاب بلا سے یہ کیوں خوف دلاتی ہے
کیا ہم کو بچائے گی شعلوں سے گھری دنیا

معمول جدائی ہے گو پھول کی گلشن سے
لیکن جو ہوئی عنقا خوابوں میں بسی دنیا

سب خواب پرانے ہیں ہر چند فسانے ہیں
ہم روز بساتے ہیں آنکھوں میں نئی دنیا

ہم دونوں سفر میں تھے معلوم نہیں اب کچھ
کیا تو نے کہی دنیا کیا ہم نے سنی دنیا

فردائے قیامت کا وعدہ ترا پرساں ہے
اب کتنی بچیں سانسیں اب کتنی بچی دنیا

ہر بات پہ حیرانی ہر لمحہ کی نگرانی
دینا سے عطا یعنی کب سمجھی گئی دنیا

بات جب پانی پہ تصویر بنانے کی ہوئی
شرط دنیا سے مری وعدہ نبھانے کی ہوئی

ہو گئیں آنکھیں جو پتھر تو تعجب کیوں ہے
جب خطا ہم سے بھی کل خواب سجانے کی ہوئی

زندگی سمجھا کئے سانس ہی لینے کو فقط
یہی تدبیر مگر خود کو گنوانے کی ہوئی

اپنی روداد سفر کس کو سنائیں کہ یہاں
آنے والے کو سزا لوٹ کے جانے کی ہوئی

پھر ان آنکھوں نے کیا دل کے مصور کو طلب
پھر ضرورت تری تصویر بنانے کی ہوئی

اب جو خوابیدہ ہے سورج تو سبب ظاہر ہے
رات بس رسم ادا ہم کو جگانے کی ہوئی

یوں بھی گزرا ہے ترا دور مسیحائی کہ
مجھ کو جرأت نہ کبھی زخم دکھانے کی ہوئی

جنگ ہی ایسی تھی کہ جنگ کا حاصل یہ تھا
جیت اپنی نہ ہوئی ہار زمانے کی ہوئی

جب قلم ہاتھ میں آیا تو عطا ایسا لگا
اک ملاقات زمانے کی زمانے ہوئی

○○

غزلیں

عطا عابدی

گھر میں یوں اجالا ہوگیا ہے
اک اک ذرہ شرارہ ہوگیا ہے
نہیں سنتا کوئی شور قیامت
زمانہ کتنا بہرا ہوگیا ہے
ہوا گھر رشک گلشن باغباں کا
چمن کا رنگ پھیکا ہوگیا ہے
ہیں سب اپنے تخیل میں مجاہد
عدو ذہنوں میں پسپا ہوگیا ہے
قصیدے کی نئی تعریف لکھوں
تعارف اب قصیدہ ہوگیا ہے
بہت اونچی ہوئیں دیواریں دل کی
عجب اس گھر کا نقشہ ہوگیا ہے
کبھی سچ بولو تو معلوم ہوگا
عطا کیوں آج تنہا ہوگیا ہے

کوئی بھی خوش نہیں ہے اس خبر سے
کہ دنیا جلد لوٹے گی سفر سے
میں صحرا میں سفینہ دیکھتا ہوں
سمندر کوئی گزرا ہے ادھر سے
سنبھالو اپنا حرف داد و تحسیں
میں کب ہوں مطمئن عرض ہنر سے
خطا ہے یہ جواز اپنی خطا کا
خطائیں ہوتی رہتی ہیں بشر سے
سبھوں میں صرف کمیاں دیکھتا ہے
وہ ہے محروم کیا حسن نظر سے
غضب کا آئے گا سیلاب یارو
کہ گزرا ہے بہت سا پانی سر سے
بلندی اتنی بھی اچھی نہیں ہے
اتارو اب عطا کو دار پر سے

○○

غزلیں

عطا عابدی

وقت نے یوں لکھا ہے امتحاں ہتھیلی پر
ہم ہمیشہ رکھتے ہیں اپنی جاں ہتھیلی پر
بنتے مٹتے رہتے ہیں دائرے لکیروں کے
روز ہم بناتے ہیں اک مکاں ہتھیلی پر
پڑھنے والے پڑھتے ہیں لکھنے والے لکھتے ہیں
اپنی زندگانی کی داستاں ہتھیلی پر
قوت سماعت کا طلسم ہی کچھ ایسا ہے
ہم بھی کان دھرتے ہیں بے زباں ہتھیلی پر
عزم ہائے پارینہ ہم سے اب بھی قائم ہے
اب بھی ڈھونڈ تے ہیں ہم ہر نشاں ہتھیلی پر
دھوپ اپنی یورش کے ہے مظاہرے میں گم
ڈھونڈتے ہیں ہم عابد سائباں ہتھیلی پر

دیکھنے والے اگر مجھ کو نہیں جانتے ہیں
ہم بھی کب انکی نگاہوں کو حسیں جانتے ہیں
تیری آغوش میں اجداد ہیں آسودۂ خاک
اے وطن ہم تجھے فردوس بریں جانتے ہیں
چاہتے ہیں کہ خداؤں میں گنے جائیں ہم
اور ہم اپنی خدائی کو نہیں جانتے ہیں
اجنبی بن کے ادھر تکتی ہے سجدے کو زمیں
ہم ادھر گرد سے محفوظ جبیں جانتے ہیں
قصر عالی کے مکینوں سے یہ اب کون کہے
خود کو ہم آج بھی پیوند زمیں جانتے ہیں
کچھ تو ہے بات عطا، اہل نظر کے آگے
اپنے افکار ہم اب بھی حسیں جانتے ہیں

OO

غزلیں

عطا عابدی

لاکھ طوفاں ہو سوتے ہی نہیں
زندگی ہم تجھے کھوتے ہی نہیں
بے خطر راستے ہوتے ہی نہیں
ہم اس احساس کو ڈھوتے ہی نہیں
خواب دکھلائے گی دنیا کیوں کر
ہم کبھی نیند میں ہوتے ہی نہیں
خامشی اپنی ہے گویا جیسے
کان دیوار کے ہوتے ہی نہیں
آپ کا غم وہ امانت ہے کہ ہم
خود کو کھو کے کبھی کھوتے ہی نہیں
کیا کمی ہوتی جہاں میں سوچیں
آپ اور ہم بھی جو ہوتے ہی نہیں
شاید اب دل سے جدا ہیں آنکھیں
ہو عطا غم کوئی روتے ہی نہیں

تماشا زندگی کا روز و شب ہے
ہماری آنکھوں کو آرام کب ہے
چمکتی ہے تمنا جگنوؤں سی
اندھیری رات میں رونق عجب ہے
ضرورت ڈھل گئی رشتے میں ورنہ
یہاں کوئی کسی کا اپنا کب ہے
کہاں دنیا کہاں اس کے تقاضے
وہ تیرا میکدہ یہ میرا لب ہے
زباں ہی تیرا سرمایہ ہے لیکن
عطا خاموش! یہ جائے ادب ہے

○○

غزلیں

عطا عابدی

مصیبت آج بھی سر پہ کھڑی ہے
سمجھتا ہے مسرت کی گھڑی ہے
سفر کی گرد جو سر پہ پڑی ہے
چمک میں مہر تاباں سے بڑی ہے
کہاں تک خوش کوئی تجھ کو رکھے گا
تو اے دنیا تصور سے بڑی ہے
بچانے والے سے واقف نہیں کیا
مجھے دنیا مٹانے پہ اڑی ہے
صدی ہے صرف لمحوں کا ذخیرہ
اور اس پہ آنکھ انساں کی گڑی ہے
کبھی بے راہ میں ہونے نہ پایا
مجھے استاد کی حاصل چھڑی ہے
سبھی جھکتے ہیں اس کے آگے لیکن
مرے قدموں میں یہ دنیا پڑی ہے
کبھی آہستہ سے اتری تھی دل میں
محبت اب مرے سر پہ کھڑی ہے
حماقت پر مری ہنستے ہیں دانا
یہی دانائی کی لیکن کڑی ہے
عطا دیکھو قیامت آگئی کیا
یہ دنیا مرے سر ہانے کھڑی ہے

بزعم خویش وہ احسان کرکے
بہت خوش ہے چمن ویران کرکے
گئے مارے کہ تھے سوئے اگرچہ
مصیبت آئی تھی اعلان کرکے
ہمیں مشکل میں ڈالا ہے کسی نے
ہماری زندگی آسان کرکے
میں ٹھہرایا گیا احساں فراموش
ہوا بے فائدہ احسان کرکے
سزا پائی ہے شب بھر جاگنے کی
کسی انجان کو مہمان کرکے
کسی کو بھول بیٹھا ہے زمانہ
کسی کو یاد ہر اک آن کرکے
نشستیں کھو چکیں گویائی اپنی
ملا کیا چائے میں طوفان کرکے
دعائیں زندگی کی کر رہا ہوں
خود اپنی موت کا سامان کرکے
خرد مندوں کی صحبت میں ہوں لیکن
جنوں کو وقت کا عنوان کرکے
کتابیں لکھ کے کوئی مر رہا ہے
جیو تم شعر کو دیوان کرکے

OO

رباعیاں

ناوک حمزہ پوری

[۱]

جو کشت رباعی میں اگاتے ہیں ژاژ
کف اشعار پر جماتے ہیں ژاژ
پوچھو تو ذرا کہ پیتے ہیں کیا حضرت
معلوم ہوا ہے یہ کہ کھاتے ہیں ژاژ

[۲]

یوں کہئے کہ ہے فکر میاں جمن کژ
لگتا ہے انہیں اگر اصول فن کژ
واقف جو طریق رقص سے ہو نہ سکے
آتا ہے نظر انہیں کو ہر آنگن کژ

[۳]

ہر چند ہے روئیدگی صحرا ژاژ
مائل بہ سفیدی ہے ہرا کانٹا ژاژ
دیگر چوپایوں کو تو جانے دو
رغبت سے اونٹ بھی نہیں کھاتا ژاژ

[۴]

رکھیو نہ اساس فکر ہرگز تم کژ
اچھا نہیں ہو گر نظر مردم کژ
ٹیڑھی ہو کوئی چیز تو مسعود نہیں
دیکھو، ہوتی ہے عقرب کی دم کژ

[۵]

اس شوخ پری وش کی زباں ہے کژمژ
ظالم کا ہر اک طرز بیاں ہے کژمژ
ہر بات اسکی مری سمجھ سے ہے پرے
مبہم ہے تبسم بھی فغاں ہے کژمژ

[۶]

یہ کل کا ہے واقعہ ہمارے تھے ژورژ
ہم ان کو عزیز، ہم کو پیارے تھے ژورژ
یہ راز مگر آج ہوا طشت از بام
پوشیدہ رماد میں شرارے تھے ژورژ

[۷]

حج کعبہ کو جانے والا ہے ژیژ
ہر شبہے، ہر شک سے بالا ہے ژیژ
تعظیم کرو اس کی جناب ناوک
یہ بندۂ اللہ تعالیٰ ہے ژیژ

○○

رباعیاں

ظفر صدیقی کے نام

سلطان اختر

کانوں میں بنا لیتا ہے رستہ اپنا
پرواز تری اپنی ٹھکانہ اپنا
پرچھائیں بھی تجھ پر کسی شاعر کی نہیں
تو سب سے الگ ہے ترا لہجہ اپنا

○

ہر بزم میں گلبار ظفر صدیقی
روشن ترے اشعار ظفر صدیقی
دستار سخن زیب تجھے دیتی ہے
اعلیٰ ترا معیار ظفر صدیقی

○

یہ کیسا طلسم رم آہو ہے ظفر
جس سمت نظر جائے ادھر تو ہے ظفر
روشن جو گلستان ادب میں ہے تمام
ترے سخن گرم کی خوشبو ہے ظفر

○

اچھوں سے بھی اچھا ہے ظفر صدیقی
اپنا ترا لہجہ ہے ظفر صدیقی
غزلیں ہوں کہ قطعات ہوں یا نعت شریف
ہر صنف میں یکتا ہے ظفر صدیقی

○

خوش رنگ بہت منبر و محراب ظفر
روشن ورق دل پہ ہے مہتاب ظفر
ارباب سخن داد نہ دیں کیوں اختر
ہر شعر میں تابندہ ہے آداب ظفر

○○

پروین شیر

عارضی

دور فضا میں
جگمگ کرتے
جگنو کو مٹھی میں لینے
کی خواہش میں
ساری دنیا سے کترا کے
جگنو کے پیچھے بے صبری
کے عالم میں دوڑ دوڑ کر
اس کو پا لینے کی دھن کی
لذت میں جیون اک
امرت رس کا پیالہ تو بنتا ہے لیکن
جیسے ہی جگنو میری مٹھی میں
آ جاتا ہے
امرت رس بھی
دھیرے دھیرے
چھلک چھلک کر
گر جاتا ہے ـــــ!
جگنو بجھ کر
بس اک کیڑہ
بن جاتا ہے ـــــ!!

○○

گھٹن

سانس کے زیر و بم سے الجھتے ہوئے
ڈوبتے اور ابھرتے ہوئے
تیر کر پار کرنا ہے گہرا سمندر مجھے
اپنے کمزور ہاتھوں سے لڑنا ہے لہروں کی یلغار سے
شارک خونخوار دانتوں سے حملہ کرے
یا چٹانوں سے ٹکرا کے نازک بدن پر خراشیں پڑیں
جسم کی ناؤ کھینا ہے ہر حال میں
ختم ہونے کو آتا نہیں ہے سمندر کا یہ
بے کراں سلسلہ
ساحلوں کا کہیں پر گماں بھی نہیں
صرف طغیانیاں ہیں یہاں
مستقل جان لیوا مشقت کی یکسانیت
کا یہ گھٹن
جسم کی لکڑیوں میں چھپا
کھا رہا ہے اسے دم بدم!
بیچ گرداب میں
کاٹھ کی کھوکھلی
ناؤ لہروں سے کب تک لڑے؟

○○

پرویز مظفر

تنقید کا چکرویو

افسانہ
کیسے کیسے تجربات لئے
اپنی مٹی سے اگا
دکھ درد کو سمیٹے
اپنے آپ کو طلسمی چادر سے
لپیٹے ہوئے
جب وادی تنقید میں داخل ہوا
تو دیدہ ور نقادوں نے
اسے چاروں طرف سے
گھیر لیا
اور اس پر اپنے قلم کے
زہر بھرے تیروں سے
اتنے وار کئے
کہ بیچارا لہولہان
زمین پر پڑا سسکتا رہا
اور نظم
اسے دلاسا دیتی رہی

○○

ANTIQUE REVANGE

دبے پاؤں
چپکے سے جب
اپنے اندر داخل ہوا
پرانے خیال
سانس کی الماری پر
بہت مدت سے
ارادوں میں لپیٹے رکھے ہوئے تھے
دیکھتے ہی اچھل پڑے
ارے یہ کیا
آنکھوں میں آنسو
وہ تو طوفان لئے پل رہے تھے
بدلے کی آگ میں جل رہے تھے
آج سب کو آزاد کیا
تو کتنا محفوظ ہوں

○○

پرویز مظفر

ہمارے زمانے کے لوگ

اپنی اچھائیاں
اس کی برائیاں
دونوں اجاگر کرتے رہے
زندگی بھر خود سے لڑتے رہے
ہونا تو یوں چاہئے تھا
کہ اس کی اچھائیوں پر
اور اپنی برائیوں پر
نظر رکھتے
اس طرح موقع ملتا ہمیں
اپنے اندر اور باہر اگنے کا
مگر ایسا کہاں......

○○

حد سے گزر کر

بے چین آتما
اس سے ملنے کے لئے
ملکوں ملکوں سرحدوں سرحدوں
بھٹکی، پھر بھی کہیں نہ ملا
تھک ہار کر ہیٹر کے سامنے
کرسی پر براجمان
آنکھیں
ابھی بھی تلاش میں ہیں
اس کی
جو برسوں سے نہ ملا
اور سکون کہتے ہیں جسے

○○

غزل ہے شرط

(غزلوں کے منتخب اشعار)

امین اشرف

[۱]

درخشاں ہو جو وہ مہ زادۂ شب — بکھر جائے غبارِ جادۂ شب

[۲]

ڈھل کے نغموں میں اڑی رات تری یاد مگر — دے کے دستک درِ ناہید سے لوٹ آئی ہے

[۳]

میں تو پروردۂ غم ہوں مگر اے موجِ بلا — تجھ پہ کیا گزری مرے سر سے گزر جانے تک

[۴]

جب ہم چلے تو ساتھ چلی بادِ خوش خرام — جب تھک گئے تو گردِ رہِ جستجو ہوئے

[۵]

طے کر رہا ہوں خواب و حقیقت کے فاصلے — مانا کہ میں کہاں تری آوازِ پا کہاں

[۶]

آسماں کیا ہے اگر دل میں نمودِ غم ہو — آنکھ نم ہو تو گہری خیزیٔ دریا کیا ہے

[۷]

وہ شام ہے کہ چمکتی ہے دھوپ آنکھوں میں — وہ قہر ہے کہ برسنے لگے ہیں ویرانے

[۸]

مجھے تو شوخیِ زنجیرِ در نے روک لیا قدم جو اٹھتا تو بالائے کہکشاں ہوتا

[۹]

ترے ستم نے بچایا ہے نازِ بیجا سے نہ ٹوٹتا دلِ وحشی تو آسماں ہوتا

[۱۰]

خمارِ تشنہ لبی، اعتبارِ افسانہ طلب کی آنچ میں جلتا ہے رقصِ پروانہ

[۱۱]

طلب میں مجھ سے تو لمحہ بھیاک ہیں کتنا اسی خمار نے کاٹے ہیں کوہ و دریا بھی

[۱۲]

جو دی ہیں نعمتیں یارب تو پھر حق تصرف دے نظر اپنی، دماغ اپنا ہے دل، اپنا نہیں ہوتا

[۱۳]

ذرا کچھ زنگل نیکو کار بھی سید امین اشرف فقط نام و نسب سے آدمی اچھا نہیں ہوتا

[۱۴]

بے تعلق ہی سہی وہ مگر اس شخص کے پاس دل جو لگتا ہے تو لگنے کا سبب بھی ہوگا

[۱۵]

یہ روح و جسم کا سارا تصادم حسرتوں سے ہے میسر کیا نہیں ہوتا پریشانی نہیں جاتی

[۱۶]

وہی جن کی سمجھ میں فطرت اشیاء نہیں آتی وہ دنیا کو جہانِ بندۂ و آقا سمجھتے ہیں

[۱۷]

رو برو آئینہ ہوتا اور محشر دیکھتے ان کو آتی تھی حیا مجھ سے تو چھپ کر دیکھتے

[۱۸]

وہ مہ خوبی تو ابرِ ناشناسائی میں ہے یہ گھٹا کھل کر برس جاتی تو منظر دیکھتے

[۱۹]

کبھی کبھی صلۂ قربِ عارفانہ ہوا خیال خواب ہوا، واقعہ فسانہ ہوا

[۲۰]

یہ دوستوں سے ہیں بہتر کہ یاد رکھتے ہیں ہنروروں کا دلِ دشمناں ٹھکانہ ہوا

[۲۱]

بہار ایجاد کرتا ہوں گریباں چاک کرتا ہوں	جنوں کو سبز رکھا غیرت منت پذیری نے

[۲۲]

یہ آسمان زمیں بوس بے سبب تو نہیں	محبتوں کے لئے کچھ فروتنی ہی سہی

[۲۳]

آدمی ہونا مقدر تھا تو یکتا ہوتے	کہیں نغمہ، کہیں جگنو، کہیں دریا ہوتے

[۲۴]

کیا بنوں خیر کی فطرت کہ ہے آزار طلب	کوئی لمحہ نہیں لگتا سگ دنیا ہوتے

[۲۵]

خوشی ملی جو ذرا سی عذاب پلنے لگا	جو سانحہ نہیں گزرا وہی مچلنے لگا

[۲۶]

نہیں یہ عشق دلآسائی جمال ہے یہ	کسی نے دیکھ لیا اور جی بہلنے لگا

[۲۷]

شہر خرد کا ہر بشر ہے طائر بے بال و پر	اک شاخ پر بیٹھا ہوا، ٹوٹا ہوا، سہا ہوا

[۲۸]

دل شہر تحیر ہے کہ وہ مملکت آرا	کیا سلطنت بلخ و سمرقند و بخارا

[۲۹]

اک چاند ہے آوارۂ و بےتاب وفلک تاب	اک چاند ہے آسودگی ہجر کا مارا

[۳۰]

خیال دل سے نظر ہے خیال سے نازک	ذرا سنبھال کے گلدستۂ تمنا دیکھ

[۳۱]

یہ واقعہ ہے کہ خوشبوئے مشک آتی ہے	بلائے جاں سر بازار مجھ کو رسوا دیکھ

[۳۲]

ندی کے درمیاں سیدھی سڑک ہے	ندی کے پار کچا راستہ ہے

[۳۳]

جسے ناخوب کہتے ہیں اسی کو خوب کہتے ہیں	تمیز خیر و شر میں نکتۂ صد معتبر کیا ہے

[۳۴]

دم نظارا اس نے چپکے چپکے کھول دیں زلفیں
مرا یہ پوچھنا ہی تھا کہ ناز بحر و بر کیا ہے

[۳۵]

دل بھی لگ جائے گا مشکل سہل بھی ہو جائیگی
کار دنیا میں ملا دیں کار پیچ و تاب بھی

[۳۶]

میں تھا، نا معلوم شے تھی، دیدۂ حیراں تھا
ایسے منظر سے قریں تھا موجۂ سیلاب بھی

[۳۷]

یہ جہاں کس کا ہے دو لفظوں میں ہے اسکا جواب
یا فساد زر کا ہے یا جوہر شمشیر کا

[۳۸]

میں زمیں پر، میں ہی طائر اور میں ہی آسماں
اپنے اندر دیکھنا بھی جیسے باہر دیکھنا

[۳۹]

عالم وارفتگی میں کیا سے کیا ہو جائے گا
تھا قیامت اس پری رو کا سنبھل کر دیکھنا

[۴۰]

ترک دنیا ہو کہ دنیا کی طلب ہو یارو
یہ وہ سودا ہے جو سر سے نہیں جانے والا

[۴۱]

عطائے رب ہے شعر و شاعری، علم و ہنر مندی
جنوں، زور خرد، خون جگر سے کچھ نہیں ہوتا

[۴۲]

کھلا گلاب تو منظر بدل گیا سارا
جمال صبح بھی حیرت میں، آبگینہ بھی

[۴۳]

خراش ذہن بھی ہے زینت نگاہ بھی ہے
یہ زندگی خس و خاشاک بھی نگینہ بھی

[۴۴]

عالم بھی قفس رنگ ہے ایسا کہ نظر کو
اس دام تحیر سے رہائی نہیں دیتا

[۴۵]

عمر و عشق دونوں سے کیا گلہ کہ چہرے پر
ہر شکن کا باعث ہے انتشار اندر کا

[۴۶]

پھر بھی فردوس چشم و گوش ہے یہ
ساز نادیدہ، ان سنی آواز

[۴۷]

تھی کبھی آفتاب اور کبھی در سے ٹکرا کے رہ گئی آواز

[۴۸]

زلفیں تھیں کہ صورت گر تسکین تمنا خوشبو تھی کہ اک طبلۂ عطار کھلا تھا

[۴۹]

پڑتی تھیں جو نظریں تو سمٹتا تھا بدن بھی بارش جو تھی مصر کا بازار کھلا تھا

[۵۰]

امین اشرف وہ سودا ہوں کہ میر و مومن و غالب چمک جائے کوئی طرز بیاں کچھ دیر لگتی ہے

OO

غزلیں

غلام مرتضیٰ راہی

ڈبو کر دیکھنا تھا یار مجھ کو
سکھایا تیرنا بیکار مجھ کو
زباں کی دھار سے دیکھا ملا کر
لگی کچھ تیز کم تلوار مجھ کو
بٹھا رکھا مجھے سائے میں جس نے
گرانی تھی وہی دیوار مجھ کو
جنہیں ہے ناز اپنے فاصلوں پر
پکڑنے دیں ذرا رفتار مجھ کو
کبھی ہوتی نہ پھر لڑنے کی ہمت
ملی اب تک نہ ایسی ہار مجھ کو
کسی نے بھیج کر کاغذ کی کشتی
بلایا ہے سمندر پار مجھ کو
کبھی خالی نہ پائی میں نے جھولی
ملا پر، کچھ کا کچھ ہر بار مجھ کو

سامنے کس کے پڑی جاتی ہے
میری دیوار ہٹی جاتی ہے
اور کیا رہ گیا پینے میں کہ جو
سیری ہونے سے رہی جاتی ہے
تاب دید اس کی اگر مجھ میں نہیں
دھند بیکار چھٹی جاتی ہے
کم ہے رفتار کہ جس تیزی سے
راہ ہموار ہوئی جاتی ہے
پہلے چنگاری اڑا لائی ہوا
لے کے اب راکھ اڑی جا تی ہے
کشتیاں جائیں منائیں چھٹی
جھیل میں برف جمی جا تی ہے
شکل دنیا کی کوئی ہے کہ نہیں
بگڑتی جا تی ہے، بنی جاتی ہے

OO

غزل

شاہین

صرصر آباد میں اک کنج چمن ہے شاداب
ہر کوئی مہر بہ لب اور سخن ہے شاداب
ذہن اور دل نے بہم میرا بھرم یوں رکھا
سر کشیدہ بھی ہوں اور نخل بدن ہے شاداب
ایسے عالم میں کہ ہے قحط رگوں میں خوں کا
گل ہیں آسودہ کہ ہر غنچہ دہن ہے شاداب
دور کا ہی یہ نظارہ سہی حصہ میرا
شاد و آباد ہوں میں بھی کہ وطن ہے شاداب
گھر بھی کچھ ایسا خرابہ تو نہیں اب کے برس
اور چاروں طرف اگتا ہوا بن ہے شاداب
رات تک کوئی عجب کیا کہ ستارہ بن جائے
اس قدر صبح کی یہ پہلی کرن ہے شاداب
پاؤں اکھڑے بھی اگر تیز ہوا میں شاہین
خوش ہوں یہ رہ گزر سرو و سمن ہے شاداب

○○

غزلیں

رونق شہری

کہیں کھلے گا فسردہ بدن رہے گا نہیں
ہمیشہ نذر خسارہ بدن رہے گا نہیں

زوال قرب سے ہے آشنا بہر صورت
وہ جانتا ہے ہمیشہ بدن رہے گا نہیں

ذرا غروب رمق کی طرف نظر تو اٹھا
جہاں میں کوئی ستارہ بدن رہے گا نہیں

گراں یہ بار کفالت تجھی سے ممکن ہے
ترے علاوہ بھروسہ بدن رہے گا نہیں

تری ہی آتش فرقت میں جھونک دوں گا اسے
ترے بغیر اکیلا بدن رہے گا نہیں

کرے گی ایک ہی مچھلی سبھوں کو دریا برد
کھلے گا سب پہ عجوبہ بدن رہے گا نہیں

نظر میں رکھنی ہے مجبوری یہ لذت وصل
ترا خیال اور اپنا بدن رہے گا نہیں

شئے فضول ہے رونق گمان لمس خیال
رہے گی ایسی ہی دنیا بدن رہے گا نہیں

سب اڑنے والے لوگ ہیں آندھی میں ہم نہیں
بیٹھے کسی کی مرضی سے کشتی میں ہم نہیں

لوٹیں گے بھی تو بھیس بدل کر اے خاک زاد
ملنے کو اپنے جسم کی مٹی میں ہم نہیں

پھیلے گا انتشار کہا تھا فقیر نے
جب تک بندھیں گے ایک ہی رسی میں ہم نہیں

اتنا ہوئے ہیں تنگ کہ جنگل میں شور ہے
دوبارہ آئے لوٹ کے بستی میں ہم نہیں

لگتے ہیں بدگمان سے کچھ اپنے آپ سے
کرتے اسے شمار بھی نیکی میں ہم نہیں

ہونٹوں پہ تھا مسائل صد مشترک کا ذکر
عقدہ کھلا طویل سی عرضی میں ہم نہیں

○○

غزل

قوس صدیقی

'صحرا آنچل' کو ہونا ہے تپ تپ کے اشجار صفت
چلتے چلتے راہ کا پتھر ہو جاتا ہے یار صفت
اس گھر کو میں ڈھونڈ رہا ہوں جو گھر ہے گھر بار صفت
چاندنی کیا اترے آنگن میں، آنگن ہے دیوار صفت
'پھول مسافر' کے تلوے کب ٹھہرے ہیں گلزار صفت
ان راہوں پر چل کے دیکھیں جو راہیں ہیں خار صفت
ایسے عہد میں ہنس کے جینا رقص تپاں کی بلہاری ہے
صبح کھڑی تلوار صفت تو شام ملی انگار صفت
دیدۂ حیراں، منظر منظر نقش گریزاں سے الجھا ہے
ہر چہرہ آدھا لگتا ہے ہر نسبت بیمار صفت
'شور ندی' کے دونوں کنارے آپس میں کب مل بیٹھیں
یہ دنیا، دنیا باقی ہے جب تک ہے بازار صفت
رقصِ زمانہ کھیل نہیں ہے مانگے رنگ 'زیستائی'
قوس ترے اندر بھی مہکے کچھ تو تازہ کار صفت

○○

غزلیں

سیفی سرونجی

کردار میں کچھ اور ہے تقریر میں کچھ اور
اندر سے وہ کچھ اور ہے تصویر میں کچھ اور
یہ کم نہیں کہ گاؤں میں بیٹھی ہے میری دھاک
مانا کہ اب نہیں بچا جاگیر میں کچھ اور
بے شک خدا کا شکر ہے سب کچھ ملا مجھے
لکھا ہے پھر بھی دوستو تقدیر میں کچھ اور
مانا تمہارے خواب سہانے ضرور ہیں
ہوتا مگر ہے خواب کی تعبیر میں کچھ اور
سیفی تمہارے دعوے تو نکلے سبھی غلط
بولو گے جھوٹ پھر نیا آخیر میں کچھ اور

محفل میں تمہاری کوئی چہرے اچھے نہیں
میرے بھی بدن پر ذرا کپڑے نہیں اچھے
ویسے تو مجھے پیار ہے ہر شخص سے لیکن
ملتا نہیں میں ان سے جو دل کے نہیں اچھے
اک پل میں بدلتے ہیں پڑوسی بھی تمہارے
ان پر نہ کرو ناز یہ رشتے نہیں اچھے
اٹھتی ہیں ہر اک شخص کی نظریں اسی جانب
کھڑکی میں چمکتے ہوئے پردے نہیں اچھے
سیفی تمہیں معلوم ہے غربت کا مزہ خوب
اب تو یہ سمجھ لو کہ یہ عہدے نہیں اچھے

○○

غزل

نجم عثمانی

نہ یقیں رہتا ہے اک پل نہ گماں رہتا ہے
صرف تشکیک کا نظروں میں دھواں رہتا ہے
دل میں اک آرزو انگڑائیاں لیتی ہے بہت
میری آنکھوں میں کوئی خواب جواں رہتا ہے
شاخ امید ہے صر صر کی نگہبانی میں
موسم گل میں چمن وقف خزاں رہتا ہے
وہ جو کہتا ہے تو سچ ہوں گی سب اس کی باتیں
میں جہاں رہتا ہوں، انسان کہاں رہتا ہے
سینکڑوں خوف کے سائے میں ہے دل کی دنیا
میری تاحد نظر دشت زیاں رہتا ہے
یوں تو ہیں دشمن اردو یہ سیاست والے
شعر اردو کا مگر ورد زباں رہتا ہے
بے حسی ذہن پہ طاری ہے، نہیں جانتے ہم
چوٹ لگتی ہے کہاں ، درد کہاں ہوتا ہے

○○

غزلیں

شمیم ہاشمی

جنونِ عشق جب اپنی عملداری دکھاتا ہے
تو ہاؤ ہو کی ہر جانب فضا طاری دکھاتا ہے
کبھی رغبت کبھی دنیا سے بیزاری دکھاتا ہے
مرا آئینہ دل خوب اداکاری دکھاتا ہے
عقلمندوں کی عادت ہے کہ وہ خاموش رہتے ہیں
مگر نادان ہر محفل میں طراری دکھاتا ہے
نہ اس کی روشنی اپنی نہ اس کی تاب وتب اپنی
کسی کے حسن کی یہ دل ضیا باری دکھاتا ہے
دکھاتا ہے اگر آئینہ دل جلوۂ جاناں
تو دل کے شہر پر اس کی عملداری دکھاتا ہے
نگاہِ مردِ مومن ہے شمیم اک دولت عظمیٰ
خدا بندے کو اس سے اپنی فنکاری دکھاتا ہے

ملی ہے ورثے میں دولت تو ذرداری دکھاتا ہے
وہ اپنی شخصیت کا رعب کچھ بھاری دکھاتا ہے

نئے کلچر میں رہتا ہے بدن مردوں کا پوشیدہ
برہنہ جسم نسواں اپنی چھب نیاری دکھاتا ہے

جو دولت کیلئے عورت کا استحصال کرتے ہیں
انہیں اللہ اک دن ذلت وخواری دکھاتا ہے

خطیب مسجد جامع ہیں والد محترم جس کے
وہ لڑکا شہر کی گلیوں میں سرداری دکھاتا ہے

تصنع مسکراہٹ سے جھلکتا ہے شمیم اس کا
جو اپنے نام کی خاطر رواداری دکھاتا ہے

○○

غزلیں

یعقوب تصور

نہ دی حالات نے مہلت کبھی عہد جوانی میں
وگرنہ آگ تو ہم بھی لگا سکتے تھے پانی میں
اسے ٹھہرائیں کیوں پھر مورد الزام تاریکی
ہوا خود بھی تو جلتی ہے دیوں کی ضوفشانی میں
ہیں باتیں جھوٹ سب اسکی حدود بے یقینی تک
مگر سچ بھی کبھی وہ بول جاتا ہے روانی میں
نصاب زیست میں ہے احتساب وقت بھی شامل
نہ سوچا تھا کبھی اس نے یہ دور حکمرانی میں
وہ پل بھر ہی سہی دھڑکن تو ہوتی ہے فزوں دل کی
کہیں اک موڑ ایسا بھی تو آتا ہے کہانی میں
نہ چھت اپنی نہ دیواریں، دریچہ اور نہ در کوئی
مکاں کو چھوڑ کر ہم آ گئے جس لامکانی میں
انہیں بھی ناخدائی کا بہ حد زعم دعویٰ ہے
تصور کاغذی کشتی چلاتے ہیں جو پانی میں

کہیں شمس جفا قہر تمازت بو رہا ہے
کہیں دیوار کے پہلو میں سایہ سو رہا ہے
لگاتا ہے سر بازار پاگل قہقہے جب
تو لگتا ہے کوئی انسانیت پر رو رہا ہے
بڑی گمبھیر خاموشی مسلط ہے فضا پر
عجب احساس خوف آگیں کہیں کچھ ہو رہا ہے
بہ شکل قرض، فرض دو جہاں، احسان مندی
ازل سے آدمی بار وفا ہی ڈھو رہا ہے
نہ دل راضی ہو بڑھنے کو نہ واپس لوٹنے کو
نصاب زندگی بھی کشمکش کا دور رہا ہے
بہ شرط اولیں ٹھہری ہے تحصیل منزل
تو پھر دشت مصائب کا سفر ہو تو رہا ہے
عمل کر ہی نہیں پائے اصول زندگی پر
مگر اس بات کا احساس تو ہم کو رہا ہے

○○

غزل

حفیظ بیتاب

کون معتوب ہوا اور خطا کس کی تھی
کس نے پائی ہے سزا اور سزا کس کی تھی
کوئی مونس، کوئی ہمدم، کوئی غم خوار نہ تھا
شب کے سناٹے میں رونے کی صدا کس کی تھی
درد کی شاخ ہری تھی سو ہری ہے اب بھی
''شہر میرا تھا مگر آب و ہوا کس کی تھی''
چل دیے چھوڑ کے بیمار کو سب چارہ گراں
اس نے پائی جو شفا اس میں شفا کس کی تھی
مجھ کو معلوم نہیں خالق و مخلوق کا رشتہ لیکن
میرے ہونٹوں سے جو نکلی وہ دعا کس کی تھی
میری بربادی تو لکھی تھی مقدر میں مرے
ہاں! مگر یہ تو بتا اس میں خطا کس کی تھی
ذبح کر کے وہ مجھے دیر تلک سوچا کیا
مرغ بسمل میں تڑپنے کی ادا کس کی تھی
اس کی چاہت نے تو بیتاب مجھے رسوا کیا
میں جو مصلوب ہوا اس میں بقا کس کی تھی

○○

غزل

کلیم اختر

کس سادگی سے فکر و نظر لے گیا کوئی
دل میں اتر کے لعل و گہر لے گیا کوئی
تصویر کیا اتاروں غم یار کی خدا!
گنجینۂ کمال ہنر لے گیا کوئی
نادیدہ عکس یار کو ہم دیکھتے رہے
آئینہ جمال نظر لے گیا کوئی
شب گیر خواب سار میں روشن ہوا تو کیا
سرمایۂ وجود سحر لے گیا کوئی
موج فرات پھر سے ''لہو لہر'' ہوگئی
عہد رواں کی شام و سحر لے گیا کوئی
کیسا اصول شہر ہے ، کیسا دیار ہے ؟
ہم نے شجر لگائے ، ثمر لے گیا کوئی
اب دھوپ ہی میں رہنا ہے، ناچار کیا کریں
اک ایک کر کے سارا شجر لے گیا کوئی
اختر ''سخن لباس'' میں ملبوس تھا کبھی
نقش خیال و خواب بشر لے گیا کوئی

○○

غزلیں

مظفر ابدالی

خوشی کے رنگ میں گھل جائے بے بسی جیسے
ہو بند ہاتھ میں جگنو کی روشنی جیسے
ہوا حساب وہاں یوں ہمارے سجدوں کا
ہر اک گناہ کی قیمت تھی بندگی جیسے
خیال وخواب سے اٹھتا ہے یوں دھواں اب تک
جگر کی آگ بجھی ہو ابھی ابھی جیسے
تمام لوگ گزرتے ہیں سہمے سہمے سے
اسی دیار میں رہتی ہو زندگی جیسے
ہے بے لباس ہر اک شاخ خشک یوں میری
خزاں عروج پہ اپنی پہنچ گئی جیسے
وہ مجھ سے اب بھی بہت مسکرا کے ملتا ہے
میں اس کے واسطے اب بھی ہوں اجنبی جیسے

گھٹن کو ساز لہو کو شراب ہونا ہے
غموں کی ضد ہے انہیں لاجواب ہونا ہے
ہے انتظار میں کب سے کسی کی ٹھوکر کے
وہ ایک ذرہ جسے آفتاب ہونا ہے
ہر ایک موڑ پہ لاکھوں کہانیاں ہیں مگر
کسی کسی کا مقدر کتاب ہونا ہے
ہمارے خواب کو مت جوڑیے حقیقت سے
حقیقتوں کو ابھی محو خواب ہونا ہے
بجھی بجھی سی ہے رنگت تھمی تھمی خوشبو
چمن میں آج رتوں کا حساب ہونا ہے

○○

غزلیں

مظفر ابدالی

ریت پر اک نشان ہے شاید
یہ ہمارا مکان ہے شاید
شور کے بیچ سو رہی ہے زمیں
مدتوں کی تھکان ہے شاید
درد کا اشتہار چسپاں ہے
زندگی کی دکان ہے شاید
تنہا تنہا نکل پڑے پنچھی
عہدِنو کی اڑان ہے شاید
عقل کہتی ہے مرچکا رشتہ
شوق کہتا ہے جان ہے شاید
وہ جہاں پر پگھل رہی ہے دھوپ
ہاں وہی سائبان ہے شاید
آج وہ مسکرا کے ملتے ہیں
آج پھر امتحان ہے شاید

گرفت بڑھنے لگی دل پہ یاد کی پھر سے
ستا رہی ہے بیاباں کو روشنی پھر سے
یہ کس نے نیند میں تالاب کی خلل ڈالا
یہ کس نے چھیڑ دی پنگھٹ پہ بانسری پھر سے
ہوا کو دیکھئے پھر رنگ کیا دکھاتی ہے
تصورات کے آنچل ہیں ریشمی پھر سے
ہزار بار جلایا ہے بجلیوں نے جسے
وہ ایک شاخ تمنا کہ ہے ہری پھر سے
ہنسی نے آج لبوں سے یہ مسکرا کے کہا
جو روز روز نہیں تو کبھی کبھی پھر سے
یہ سادگی جو نہیں گاؤں کی تو پھر کیا ہے
اسے یقین ہے لوٹے گا اجنبی پھر سے

OO

غزلیں

مظفر ابدالی

دل کی ڈگر سے دور کسی رہ گزر میں ہیں
ہم کب کا رک چکے ہیں مگر ہیں سفر میں ہیں
کشتی تصورات کی غرقاب ہو چکی
کچھ شوق بچ گئے ہیں سو وہ بھی بھنور میں ہیں
ہم ہیں کہ اجنبی سے بھٹکتے ہیں جا بجا
اور لوگ کہہ رہے ہیں میاں اپنے گھر میں ہیں
لگتا ہے لگ گئی ہے نظر ہم کو عشق کی
اپنی نظر میں ہیں نہ تمہاری نظر میں ہیں
ہاں صبح ہو چکی ہے مگر سرمئی سی ہے
ہم لوگ اب بھی رات کے کچھ تو اثر میں ہیں
مہر و وفا کی خیر ہو انسانیت کی خیر
اب ان کے پاسدار صف مختصر میں ہیں

خبر ہے گرم کہ ماحول شہر کا بدلا
کوئی ہمیں یہ بتائے کہ یار کیا بدلا
جنون، شوق، تڑپ، عشق، ہجر، غم، آنسو
نہ لفظ بدلے نہ لفظوں کا ذائقہ بدلا
نہ بے رخی میں کوئی ان کی فرق آیا ہے
نہ سجدہ گاہ ہے بدلی نہ سر مرا بدلا
نہ راہ بدلی نہ منزل نہ راہزن بدلے
نہ اہل شوق نے صدیوں میں راستہ بدلا
ابھی بھی اہل حرم ہنس رہے ہیں رندوں پر
نگاہ بدلی، نہ پیاں، نہ زاویہ بدلا

○○

غزلیں

مظفر ابدالی

کسی میں چھت کسی میں در نہیں ہے
مکمل تو کوئی بھی گھر نہیں ہے
زمیں پر کانچ کے ٹکڑے ہیں لیکن
کسی کے ہاتھ میں پتھر نہیں ہے
یہ سچ ہے کھیت سب سوکھے پڑے ہیں
مگر یہ کھیت ہے بنجر نہیں ہے
بھنور سے دوستی کر لی ہے میں نے
مجھے اب ڈوبنے کا ڈر نہیں ہے
معمے کی طرح ہے دل ہمارا
جو اکثر ہے بھی ر اکثر نہیں ہے

آگ میں رہتے ہوئے آگ کا نم ہو جانا
اتنا آسان نہیں صاحب غم ہو جانا
ہم نے جانا ہی نہیں فرق ہے کیا دونوں میں
تم نے سیکھا ہی نہیں آپ سے ہم ہو جانا
ہم اسی سنگ پہ پیشانی رگڑنے پہنچے
جس کی تقدیر میں لکھا تھا صنم ہو جانا
میرے پیروں میں کوئی روک لگی تھی ورنہ
کارواں کہتا رہا تیز قدم ہو جانا
گردش وقت مٹائے گی ہر اک نقش مگر
قصۂ دل تو بہرحال رقم ہو جانا

○○

غزلیں

مظفر ابدالی

بات جو بھی ہو کسی بات کے سائے میں ہے
زندگی اپنی سوالات کے سائے میں ہے
دھوپ شدت سے بڑھتی جاتی ہے منزل کی طرف
اور سایہ ہے کہ حالات کے سائے میں ہے
ہم تو اجداد کی میراث ہیں اور کچھ بھی نہیں
بادشاہت ہے تو خیرات کے سائے میں ہے
اک مصور نے یہ تصویر بنائی گھر کی
ایک صحرا ہے جو برسات کے سائے میں ہے
نیند آنکھوں سے کہاں دور ہوئی ہے اب تک
دن تو نکلا ہے مگر رات کے سائے میں ہے
کیا غلامی ہے بلندی پہ لئے جاتی ہے
کیسا درجہ ہے جو درجات کے سائے میں ہے
طور و معراج بنا جاتا ہے دل میں میرے
ایک لمحہ جو ملاقات کے سائے میں ہے
ذوق پندار مرا درد سے یہ بول اٹھا
کوئی تو ہے جو مری ذات کے سائے میں ہے

خدا بھی کیسا ہوا خوش مرے قرینے پر
مجھے شہید کا درجہ ملا ہے جینے پر
کھنڈر کے گنبد و محراب جاگ اٹھیں گے
اسے کہو کہ وہ دھیرے سے آئے زینے پر
لکیر ہے نہ کوئی رنگ ہے نہ کلمہ ہے
عجیب نقش بنایا ہے میرے سینے پر
ابھی امید نئی وسعتوں کی قائم ہے
ابھی وہ لوٹ کے آیا نہیں سفینے پر
چھتیں بھی بٹ چکیں آنگن بھی بٹ چکے لیکن
چھڑی ہے جنگ کہ ہے کس کا حق دفینے پر

○○

میرے نقطہ نظر سے

راستے کی بات (شعری مجموعہ)

مصنف : ارمان نجمی سن اشاعت : ۲۰۰۸ء

ضخامت : ۱۷۶ صفحات قیمت : ۱۸۰ روپے

ناشر: تخلیق کار پبلشرز، B/۱۰۴ اپاور منزل، آئی بلاک، لکشمی نگر، دہلی-۹۲

ارمان نجمی میرے یار غار کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ اکثر ملک سے باہر رہتے ہیں۔ رابطہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن جب واپس ہوتے ہیں تو پھر وہی فضا قائم ہو جاتی ہے جو پچاس سال پہلے تھی۔ ارمان نجمی پیشے کے اعتبار سے سرجن ہیں اور اپنے فن میں بہت کامیاب بھی ہیں۔ غیر ملکوں میں اپنا فریضہ انجام دیتے ہیں لیکن اپنی مصروفیت کے باوجود شعروادب کو نہیں بھولتے۔ انہوں نے مختلف صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزلیں زیادہ کہی ہیں۔ مضمون نگاری کی طرف بھی مائل رہے ہیں اور ان مسائل پر لکھتے ہیں جو آج خصوصی طور پر مسلمانوں سے عبارت ہیں۔ اسلامیات سے ان کی گہری دلچسپی ہے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہیں لیکن کسی مسلک کے پیرو نہیں، کسی جماعت کے رکن نہیں، اگر وہ کسی جماعت کے رکن بھی ہیں تو وہ ہے ادبی جماعت۔

ارمان نجمی اپنے مجموعوں کی اشاعت میں خاصے کاہل رہے ہیں۔ حالانکہ ہندوپاک کا شاید ہی کوئی رسالہ ہو جس میں ان کی تخلیقات مسلسل اشاعت پذیر نہ ہوئی ہوں۔ شعری مجموعے کی اشاعت سے گریز کا سبب میں نہیں سمجھ سکتا لیکن خیر سے ان کا ایک اور مجموعہ "راستے کی بات" گذشتہ سال یعنی ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے کے "پیش لفظ" میں انہوں نے اپنے پیشے، اپنی شاعری اور اپنے ادبی موقف کے بارے میں بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ انہوں نے

اپنے ''پیش لفظ'' جس کا عنوان ''راستے کی بات اور میں'' ہے، میں جو باتیں قلمبند کی ہیں۔ان میں مندجہ ذیل نکات توجہ طلب ہیں:

(۱) ''راستے کی بات'' کی تمام تر غزلیں وطن سے دور اجنبی دیاروں میں کہی گئی ہیں۔

(۲) ان کی اپنی شناخت کا بحران تو اب اپنی زمین اور اپنے آسمان کی فضاؤں کو چھورہا ہے۔

(۳) سرجری کے پیشے نے ایک اضطراب آمیز سیماب وشی ان کے مزاج میں داخل کردی ہے۔

(۴) ان کا تخلیقی عمل ان لمحوں سے ہمکنار رہا ہے جو شام کی دہلیز سے رات کے آخری پہر یا کبھی کبھی طلوع سحر تک ہجر و وصال کی مختلف کیفیتوں سے معمور رہے ہیں۔

(۵) ملک کا بٹوارہ جس ہولناک کشت وخون پر منتج ہوا وہ ہمارے قدآور سیاسی رہنماؤں کی دور اندیشی پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔

(۶) ۱۹۷۱ء میں پاکستانی خانہ جنگی اور نئی مملکت کا قیام اور اس کی غارت گری ان کے ذہن میں تازہ ہیں۔

(۷) ۱۹۶۷ء میں اسرائیلی جارحیت کے نتیجے میں مصر، اردن اور شام کی افواج کو جس ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا، وہ ان کے ذہن میں ہے۔

(۸) ملک کے طول وعرض میں مسلم کش فسادات کی آگ جس طرح اور جن ناپاک ہاتھوں نے بھڑکائی، وہ بھی ان کے ذہن میں محفوظ ہے۔

یہ وہ نکات ہیں جن کے پس منظر میں ارمان نجمی شعر کہتے رہے ہیں۔انہیں احساس رہا ہے کہ وہ شعر لکھ کر اپنی روح سے رشتہ قائم کرتے ہیں۔اس رشتے سے کئی پہلوؤں کا عرفان انہیں نصیب ہوتا ہے۔لفظوں کی کائنات کو وہ خوب سمجھتے ہیں اور اس سے رشتہ رکھنے پر مجبور ہی نہیں ہیں بلکہ اسے مضبوط کرتے رہے ہیں۔ان کے خیال میں رمز وایما سے حدیث دل ہی نہیں بلکہ حدیث حیات وکائنات کا مکمل اظہار ممکن ہے۔وہ اس کا احساس رکھتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ اذہان وافکار میں تبدیلی لازمی ہے اور ایسی تبدیلی تخلیقی تجربہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ارمان نجمی کسی متعلقہ فلسفے کے پابند نہیں، کسی ازم کو اپنے اوپر لادتے نہیں۔وہ جدیدیت کے معاملات کو بھی وجودیت کے پس منظر ہی میں دیکھتے ہیں۔وہ تنہائی کو تو پسند کرتے ہیں لیکن اس سے جو منفی صورت نکلتی ہے اس سے گریزاں ہیں۔وہ زندگی کو لایعنی نہیں سمجھتے۔انکے خیال میں انسان اور فطرت میں ازلی رشتہ ہے لہذا صحراؤں کی دھوپ، شفاف آسمان اور اسکے ساتھ بادل، بارش، بھیگی ہوئی ہوائیں، برف باری، دھند، ژالہ باری اور طوفان سب ہی انکے تجربے کا

جزو ہیں۔ جب اتنا کچھ معلوم ہو جائے تو پھر ''راستے کی بات'' پر کچھ کہنا آسان ہو جاتا ہے۔

سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ ارمان نجمی ملک سے باہر کی زندگی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے ملکوں کے معاشرے میں ان کی تنہائی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے اور بے گانگی کا ایک پہلو پیدا ہو جاتا ہے۔ کہیں کہیں تو وہ غیر ممالک کو ایک دشت کی طرح محسوس کرتے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک غزل دیکھئے:

ہے کون کس کو دیتے ہو آواز دشت میں
کھو جائیں گے یہ کانپتے الفاظ دشت میں
اپنی طرح کا اور کوئی سر پھرا کہاں
کیا مل سکے گا کوئی بھی دم ساز دشت میں
دیوانے سارے شہر کی راہوں میں کھو گئے
کس کو پڑی کہ چھیڑے کوئی ساز دشت میں
یہ گمشدہ بھٹکتی ہوئی روح کون ہے
رہ رہ کے گونجتی ہے اک آواز دشت میں
ویرانیوں میں لالۂ صحرا کا اک وجود
یوں زندگی دکھاتی ہے اعجاز دشت میں

اب آواز دشت میں لگائی جائے تو اس کی کوئی معنویت پیدا نہیں ہوگی۔ خارجی ممالک میں اپنا دم ساز کوئی نہیں، ساز و آواز کی ساری صورتیں لایعنی سی لگتی ہیں، جہاں روح بھٹکتی رہتی ہے۔ ویرانی میں کوئی لالۂ صحرا مل جائے تو تھوڑی سی کدورت دور ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہاں دشت ایک ایسا لفظ ہے جو اپنی معنویت کے لحاظ سے بڑی وسعت رکھتا ہے۔ کبھی کبھی وہ خود سے سوال بھی کرتے ہیں۔ اس سلسلے کے تین شعر ملاحظہ ہوں:

قید تنہائی زندگی تو نہیں کیا یوں ہی زندگی گزارو گے

کب تلک اجنبی فضاؤں میں ناشناسی کا دکھ سہارو گے

کب تلک ختم ہوگا یہ بن باس کب تلک اپنے گھر سدھارو گے

یہ سب دراصل اس کرب کی شناخت ہے جو انہیں اجنبی دیش میں بیزار کیے رہتی ہے۔ ایک شعر نہیں کتنے ہی اشعار ہیں جو اس قماش کے ہیں۔ چند اشعار اور دیکھئے:

دور کا لمبا سفر اور دل زدہ تنہا مسافر
ٹیڑھے میڑھے راستوں میں جا بجا بھٹکا مسافر
اجنبی بستی میں کوئی کیسے پہچانے گا تم کو
ناشناسی کے ستم سے کیوں ہو آزردہ مسافر
خود کلامی سے ذرا سی دیر کو تسکیں تو ہو گی
کم نہیں ہوگا مگر اندر کا سناٹا مسافر

ارمان نجمی اپنے غیر ملکی قیام کو خواب سے تعبیر کرتے ہیں، جس کی کچھ حقیقت نہیں، جہاں تمنائیں قتل ہوتی رہتی ہیں، رفاقتوں کی گھنی چھاؤں غائب ہے، زندگی کی سچائیاں ریزہ ریزہ ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گھر کے لوگ باگ عالم تنہائی میں ذہن کے نہاں خانے میں اتر جاتے ہیں۔ اس سلسلے کا ایک شعر دیکھئے:

عجب طلسم رہا فاصلوں میں قربت کا وہ دور جا کے بھی میرے ہی آس پاس رہا

ویسے شاعر گھر بار کو چھوڑ کے دوسری مٹی میں رچ بس نہیں سکتا اور اسے احساس ہوتا ہے کہ سفر کی گرد سے اس کا لباس میلا ہی رہے گا۔ حسرت و یاس کی ایسی کیفیت میں موصوف کی پوری غزل دیکھئے جہاں وطن کی یاد بہت سے عکس سامنے لاتی ہے۔ اس غزل میں عجیب سوز ہے اور احساس ہوتا ہے کہ شاعر واقعتاً بھیڑ میں تنہا ہے جو اپنے گھر بار کے بارے میں سوچتا ہے اور اپنے خوابوں کے مطابق تصویریں بناتا رہتا ہے۔ تو غزل دیکھئے:

سونے آنگن میں خزاں کا عکس لہرایا تو ہو گا
تم کو اس تنہا مسافر کا خیال آیا تو ہوگا
اک پریشاں زرد پتے نے تمہارے پاس آ کر
سوچ کی گہرائیوں سے تم کو چونکایا تو ہوگا
گھر کے کاموں نے بہت مصروف رکھا ہوگا دن بھر
جی مگر پھر بھی اکیلے پن سے گھبرایا تو ہو گا
گونجتا ہو گا سماعت میں کوئی حرف ستائش
زلف سلجھاتے ہوئے آئینہ دھندلایا تو ہوگا
گھل گئی ہو گی فضا میں رات کی رانی کی خوشبو
خود فراموشی کا نشہ روح پہ چھایا تو ہو گا

نیند پلکوں کے جھروکوں سے بہت ہی دور ہوگی
جاگتی آنکھوں نے کوئی خواب دکھلایا تو ہوگا
شب کی تنہائی میں اک موہوم دستک اصدائے
بے یقینی میں بھی دروازے کو کھلوایا تو ہوگا
ہجر کے لمحوں سے تسکین رفاقت کیا ملے گی
آرزو نے اپنا خالی ہاتھ پھیلا تو ہوگا

اس مضمون سے الگ ہٹئے تو کئی بہت اچھے اشعار ''راستے کی بات'' میں مل جاتے ہیں۔ میں اپنی پسند کے لحاظ سے کچھ نشاندہی کر رہا ہوں:

اے ناشناسا روشنی پہچان کے دامن میں آ
احساس کی حد سے نکل لفظوں کے پیراہن میں آ
آواز دے کر گم نہ ہو پہنائی نادید میں
صحرائے لاموجود سے دیدار کے گلشن میں آ
حرف تمنا کی جھلک مبہم رہے کیوں زیر لب
لہجے کے ساغر سے چھلک آہنگ کے بندھن میں آ

عذابوں میں گھرے دن کیسی بے نوری میں کٹتے ہیں
حصار عافیت میں شہر جاں روشن نہیں ہوتا

گہر سے جب صدف خالی ہوا تو اس کی قیمت کیا
کسی کا ظرف ہو بے مائیگی اچھی نہیں لگتی

جو دکھ ہے میرے لفظ و بیاں کا سو عیاں ہے
میں سینۂ احساس میں پنہاں تو نہیں ہوں

کتنے اشعار نقل کروں، میں کہنا چاہتا ہوں کہ ارمان نجمی کی شاعری اس درد و کرب کی مرہون منت ہے جو ان کی غیر ملکی زندگی سے عبارت ہے۔ دوسرے موضوعات بھی ضرور پیش ہوئے ہیں لیکن اس مرکزی تصور نے سبھوں کو ایک طرح سے ڈھانپ لیا ہے۔ اس تبصرے میں گنجائش نہیں کہ میں موصوف کے دوسرے موضوعات کی طرف رخ کروں اور حوالے دوں۔

اشارہ کافی ہے۔ایسے اشاروں سے موضوعات کے تنوع کا اندازہ ہوسکتا ہے۔بشرطیکہ مجموعے کا مطالعہ کیا جائے۔

ارماج نجمی Contrivance کے شاعر نہیں ہیں۔ان کا انداز بیان بے تکلف ہے۔ایسا محسوس نہیں ہوتا ہے کہ وہ لفظوں کو خواہ مخواہ تراش خراش کے عمل سے گزار رہے ہیں۔انکے یہاں الفاظ سامنے کے ہیں لیکن برتاؤ میں انکی حسیات نمایاں ہیں۔دراصل ایک ہی لفظ شعر میں معنوی اعتبار سے کئی رخ اختیار کر لیتا ہے۔قاری اپنے طور پر مفہوم کی دنیا سجا سکتا ہے بلکہ سجاتا ہی رہتا ہے۔یہ عمل اس وقت اور تیز ہوتا ہے جب شاعری ابہام کی منزلیں طے کرنے لگتی ہے لیکن نجمی اپنے کلام کو ژولیدہ نہیں بنانا چاہتے۔ابہام سے بعد کے باوجود انکے اشعار یک رخے نہیں ہوتے۔ اب پڑھنے والے کے صواب دید پر منحصر ہے کہ وہ متعلقہ شعر کے سہارے کہاں کہاں پہنچتا ہے۔

ارمان نجمی کا مجموعہ کلام ''راستے کی بات'' ایک ایسا مجموعہ ہے جسے ہر ذی شعور کو پڑھنا چاہئے۔

مبصر: وہاب اشرفی

اک ذرا اور......(شعری مجموعہ)

مصنف	: مسلم شہزاد	سن اشاعت	: ۲۰۰۹ء
ضخامت	: ۱۰۰ صفحات	قیمت	: ۱۰۰/روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-۶

مسلم شہزاد سے میں زیادہ واقف نہیں۔گاہے گاہے ان کا کلام میں نے دیکھا ضرور لیکن رابطے کی کوئی صورت نہیں نکلی، پھر ہوا یہ کہ وہ 'مباحثہ' کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنی غزلیں اشاعت کے لئے بھیجتے رہے۔اس وقت تک ان کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا تھا، اس لئے ان کی غزل گوئی کے مزاج و منہاج سے ایسا تعارف نہ تھا کہ ان پر باضابطہ کچھ لکھا جائے لیکن مسلم شہزاد نے اپنے مجموعے کی اشاعت کی طرف توجہ کی اور حال ہی میں ان کی غزلوں کا مجموعہ شائع ہو گیا۔ موصوف نے مجھے بھی اس کا ایک نسخہ عنایت کیا۔میرے سرہانے یہ کتاب پڑی رہی اس لئے کہ میں دوسری مصروفیات میں الجھا ہوا تھا۔ایک دو بار شہزاد کا فون بھی آیا کہ مجھے کتاب ملی ہے یا

نہیں۔تب میں نے وقت نکالا اور اس پر ایک نظر ڈالی۔

غزل گویوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔آئے دن مجموعے چھپتے رہتے ہیں۔ مختلف اکادمیاں اس کی اشاعت کے سلسلے میں معاون ہوتی ہیں۔ اس طرح آج کل چھپنے چھپانے کی سہولت بھی میسر ہوگئی ہے۔ چونکہ غزل کئی لحاظ سے اپنی ارتقائی منزل طے کر چکی ہے اور افکار و آراء کے اعتبار سے نت نئے اسلوب میں ان کے معیار کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا۔ میں نے اسی نقطہ نظر سے ''اک ذرا اور......'' پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ یہ مجموعہ ایسا نہیں ہے کہ اسے یکلخت نظر انداز کر دیا جائے۔ بڑے شہروں سے دور رہنے والے شعرا جلدی پہچانے نہیں جاتے۔ مسلم شہزاد کا تعلق نرکٹیا گنج (بہار) سے ہے جو کہ مشرقی چمپارن ضلع میں واقع ہے۔ عظیم آباد یعنی پٹنہ میں ان کی آمد و رفت بھی کم ہی ہوتی ہے۔ سنا ہے کہ یہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں لیکن شعر و ادب سے بھی ان کا اٹوٹ رشتہ ہے اور وقت نکال کر تخلیقی مرحلے سے گذرتے رہتے ہیں۔

جب میں زیر نظر مجموعے سے گذر رہا تھا تو کئی غزلیں مجھے بہت پسند آئیں۔ میں یہاں صرف دو غزلوں کے چند اشعار بلا تبصرہ پیش کر رہا ہوں:

جھیل میں ساکت سمندر میں سبک رفتار پانی
مختلف طرز سکونت سے ہوا دوچار پانی
یاد کر وہ دن کہ جب گونجی صدائے تشنگی تو
پھوٹ کر نکلا زمیں کی کوکھ سے بیدار پانی
ہاں بدل جائے مزاج تشنگی تو اور بات
ورنہ ہر اک نشۂ راحت سے ہے سرشار پانی

معرکہ کرتی ہے جب برکھا رتوں کا سر، ہوا
چوم لیتی ہے خوشی سے دھان کا جھومر ہوا
نرم شاخوں سے تو کرتی ہے کبھی اٹکھیلیاں
چھین لیتی ہے کبھی پر پھولوں کے زیور ہوا
ہاں، اگر دیکھے جو کچی ڈور سے اڑتی پتنگ
دوڑ پڑتی ہے تعاقب میں کوئی خود سر ہوا

دوغزلوں کے یہ چند اشعار بتا رہے ہیں کہ مسلم شہزاد غور و فکر کے شاعر ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ پرانی زمین اور وہ قافیہ ردیف جو مسلسل شاعروں کے استعمال میں ہیں، ان میں نت نئے نکات پیدا کر سکیں۔ دو شعر اور دیکھئے:

دھنک ، لالہ کی کیا تمثیل دیکھئے
عجب صدرنگ خواہش ہو گئی ہے

لمحہ لمحہ رائیگاں ہوتے ہوئے نقش نوا
رفتہ رفتہ مختلف ذوق سماعت دیکھنا

یہاں جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ عمومی نہیں ہے۔ دھنگ لالہ کی تمثیل کی تلاش شاعر کو ہے لیکن اس احساس کے ساتھ کہ خود اس کی خواہش صدرنگ ہو گئی ہے۔ شعر نیا ہے اور خیال بھی نیا۔ دوسرے شعر میں نقش نوا کے رائیگاں ہونے کو جدت طرازی کے ساتھ پیش کرنے کی سعی ملتی ہے۔ ان دونوں اشعار پر مزید غور کیجئے تو کئی سوالات ابھرتے ہیں، آخر دھنگ لالہ کی تمثیل تلاش کرنے میں خالق کی خواہش صدرنگ کیوں ہوئی؟ اس کی توجیہات اور وضاحت تفصیل طلب ہے لیکن حسن کی دید بھی دیکھنے والوں کے ذہن و دماغ کو صقیل کرتی ہے بلکہ حسن سے ہمکنار کر دیتی ہے پھر نقش نوا کا لمحہ لمحہ رائیگاں ہونا اور ذوق سماعت پر اس کا اثر، نیا خیال ہے۔ انسانی ضعف کی طرف ذہن کو لے جاتا ہے لیکن پھر بھی سیری نہیں ہوتی۔ اور یہ شعر تو مجھے حیرت میں ڈالتا رہا ہے:

اپنے قامت کی نمو کو آسماں چھوتے ہوئے
غیر کے شانے سے اپنا سر ہٹا کر دیکھنا

دراصل ایک ترغیب بھی ہے اور ایک سبق بھی۔ ترغیب یہ ہے کہ کسی چیز پر کسی کا انحصار بہت قوت نہیں پیدا کر سکتا ہاں اگر آزادانہ طور پر اپنی شناخت کرنی ہو تو بیساکھیوں سے دور رہنا زیادہ مفید ہے۔ اسکے علاوہ دوسرے معنی بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ایک اور نیا شعر ملاحظہ ہو:

رقم گل رنگ سی تحریر کر کے جا چکا لیکن
فضاؤں میں ابھی اس حادثے کی سنسنی سی ہے

اب ایک ایسی فضا کو ذہن میں لائیے کہ جو کچھ تو خون سے لبریز ہو لیکن رہنماؤں کی بھیڑ سے اور وہاں کے سلسلے میں کچھ مثبت اقدام کے ذریعہ فضا کی غمناکی کو دور کرنے کی سبیل تو پیدا

ہو سکتی ہے لیکن حادثے کی سنسنی تو بہر حال باقی رہے گی، اس کا مداوا نہیں ہو سکے گا۔ میں نے اکہری معنویت کے لحاظ سے ایک مطلب اخذ کر لیا لیکن ایسا نہیں ہے کہ کسی دوسرے رخ سے اس شعر کو نہیں دیکھا جا سکتا۔ میں ذیل میں چند ایسے اشعار پیش کر رہا ہوں جو میری نگاہ میں نہ صرف معیاری ہیں بلکہ معنوی اعتبار سے کئی ابعاد رکھتے ہیں:

راستہ چاہے جہاں رکھ دیجئے
اس پہ قدموں کے نشاں رکھ دیجئے
کوئی سایہ جانفزا اے مہرباں
سائباں در سائباں رکھ دیجئے

اڑ لئے ابھی ہوا میں دیر تک
طاق پہ اب بال و پر رکھ دیجئے

میں خندۂ گل، خندۂ لب دیکھ رہا ہوں
ترکیب توازن میں ادب دیکھ رہا ہوں

رگوں میں سیل رواں ہے اٹھان کی حد تک
تمام سطح بدن سے ابھر رہا ہے وہ
جو سوچئے تو الجھ جایئے معانی میں
جو دیکھئے تو کوئی حرف بے ریا ہے وہ

ابر چھٹتے ہی قیامت ڈھائے گی
دھوپ بہتر ہے حجابی ہی رہے

پھل پھول در آئے جو خزاں دیدہ شجر میں
جانا کہ ابھی خاک میں تاثیر تھی کچھ اور

سمٹ آئی ہے مٹھی میں حرارت خون کی ساری
ہوئی ہے کس قدر دشت بدن میں برف باری دیکھ

ان اشعار کے مطالعے سے مجھے احساس ہوتا ہے کہ "اک ذرا اور....." ایک مختلف قسم کا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے اکثر اشعار تازگی کا احساس دلاتے ہیں۔ شاعر کوشش کرتا ہے کہ مروجہ اور تسلیم شدہ اسلوب میں کچھ الفاظ اس طرح استعمال کرے جن میں کچھ نہ کچھ انفرادیت ضرور ہو۔ یہ بے حد مشکل کام ہے لیکن مسلم شہزاد نے کئی جگہ اس کا احساس دلایا ہے کہ وہ پرکاری کے وصف سے متصف ہیں۔

میرا خیال ہے کہ "اک ذرا اور....." معقول اور ذی شعور فنکاروں اور قارئین کی نظروں سے گزرے تو ضرور داد تحسین وصول کرے۔

مبصر: وہاب اشرفی

انبوہ زوال پرستاں (تنقید)

مصنف	: محمود ہاشمی	سن اشاعت	: ۲۰۰۸ء
ضخامت	: ۳۱۰ صفحات	قیمت	: ۵۰۰/روپے

ناشر: اطیب پبلشنگ ہاؤس، 241-10-9 رسالہ بازار، قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد-۵۰۰۰۰۸

"انبوہ زوال پرستاں" محمود ہاشمی کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے' جو طویل وقفے کے بعد شائع ہوا۔ اس سے قبل ان کے مضامین کا اولین مجموعہ "دست تمثیل" ۱۹۶۵ء میں پاکستان اکادمی کے زیر اہتمام منظر عام پر آیا تھا۔ محمود ہاشمی کا شمار اردو کے معروف ادیب، نقاد اور دانشور کے طور پر ہوتا ہے۔ جدیدیت کے ابتدائی دور میں محمود ہاشمی، شمس الرحمٰن فاروقی کے نہ صرف ساتھ تھے بلکہ جدیدیت کی تحریک کو موثر بنانے میں ان کا رول بے حد نمایاں تھا۔ یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ ان کے تبحر علمی کا غلغلہ تھا اور ان کی نگارشات کو بڑی اہمیت دی جارہی تھی لیکن نہ معلوم کیوں، ان کی ادبی رفتار سست پڑتی گئی اور بعض معرکوں اور ادبی ریزہ چینیوں کے سبب ان کا ادبی وقار ابر آلود ہوتا گیا اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ صرف شمس الرحمٰن فاروقی ہی جدیدیت کے حوالے سے اہم ترین رہے بلکہ دوسری شخصیتیں گم ہوگئیں۔ یہ موقع نہیں ہے کہ میں ان وجوہات کی طرف رجوع کروں جن کے سبب ایسا ہوا لیکن یہ طے ہے کہ ادبی آفاق سے خصوصاً

جدیدیت کے حوالے سے محمود ہاشمی کا رول مسلسل کم ہوتا چلا گیا اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ جب ان کا نام گم سا ہو گیا، حالانکہ ان کے بعض مضامین کے حوالے جہاں تہاں آتے رہے لیکن ایسے حوالوں سے بات نہیں بنتی، مباحث کافی آگے بڑھ گئے۔ جدیدیت کے امتیازات بھی واضح ہونے کے بعد ایک کروٹ لگ گئے اور بہت سے نئے پہلو سامنے آگئے جن کا تعلق محمود ہاشمی سے کچھ بھی نہیں رہا۔

''انبوہ زوال پرستاں'' میں متفرق اور متنوع موضوعات پر لکھے گئے ۲۴ مضامین شامل ہیں جو شاید گذشتہ پچیس تیس برس کے دوران قلمبند کئے گئے۔ بہر طور، ان مضامین کے عنوانات ہیں: 'انبوہ زوال پرستاں'، 'پچوئیشن ایک'، 'پچوئیشن ۲'، 'ایک خطرناک میلان'، 'باز دید عظمت اللہ خاں'، 'باز دید باقر مہدی'، 'ہربرٹ ریڈ اور ہم'، 'لوئیفر ناڈ ہینڈ سیلین'، 'غالب کی شاعری کا علامتی پہلو'، 'ماضی کا پوری آدمی۔نظیر'، 'میر کی شاعری کا اسم اعظم'، 'خون سے دائرہ خواب بنانے والا'، 'عذاب دانش حاضر'، 'سفر کی لذت جاوداں'، 'شجر صدا'، 'پرانے موسموں کی آواز'، 'جدید اردو تنقید کی لال کتاب'، 'تخلیقی افسانہ کا فن'، 'قرۃ العین حیدر'، 'دھڑن تختہ'، 'مانند صبح مہر'، 'محمود ایاز کے نام'، 'سفر سوختہ' اور 'عرصہ نظم'۔

محمود ہاشمی کے زیر نظر مجموعے پر جب ایک نگاہ ڈالتا ہوں تو اس میں ان کے بعض بے باکانہ اور ہنگامہ خیز مضامین کی عدم شمولیت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسے مضامین جن سے محمود ہاشمی کی عالمانہ بصیرت اور وسیع النظری کی شناخت ہوئی تھی یا جن سے ادبی لہریں پیدا ہوئی تھیں۔ مثال کے طور پر میں صرف دو مضامین کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ اول تو اس میں 'گداگری کا میکنا کاٹا' اور دوم 'گنجینۂ حرف' جیسے مضامین نہیں ہیں جن کی حیثیت طویل تبصرے کی سی ہے۔ اول الذکر مضمون سے وحید اختر کی عظمت کو ٹھیس لگی تھی (عارضی طور پر ہی سہی) اور موخر الذکر سے حسن نعیم کی شاعری پر۔ بہر طور، یہ اور اس قبیل کے کئی مضامین اس وقت زیر بحث رہے تھے اور ان کی بے باکی و پذیرائی سے زیادہ ان پہلوؤں کو پیش کیا جاتا تھا جو محمود ہاشمی دوسرے فنکاروں پر ایک طرح سے چڑھ جانے کا تیور رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب بھی دیا گیا تھا اور مثبت طریقے سے۔ ان مضامین کا اس مجموعے میں معدوم ہونا یا شامل نہ ہونا حیرت زا ہو سکتا ہے۔ پھر یہ بھی سچ ہے کہ یہ مجموعہ اس وقت مرتب ہوا جب ہاشمی خاصے بیمار رہ رہے تھے۔ ادبی اعتماد اور وقار پر ضرب آنے کی کسک تو ہوگی ہی، لہذا مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ایسے برے وقت میں ان کے ساتھ رہنے والوں کا انتخاب میں مشورہ ہوگا، جو میرے نقطہ نظر سے درست

نہیں۔ بہر طور، اب جب میں اس مجموعے پر غائر نظر ڈالتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ اس میں کئی ایسے مضامین ہیں جو آج بھی اہم سمجھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً 'ہربرٹ ریڈ اور ہم'، 'لوئی فرنانڈ نیڈ سیلن' 'غالب کی شاعری کا علامتی پہلو'، 'ماضی کا پورا آدمی۔نظیر'، 'میر کی شاعری کا اسم اعظم'، "قرۃ العین حیدر"، 'ہربرٹ اور ہم' اور 'لوئی فرنانڈ نیڈ سیلن' معلوماتی مضامین ہیں جن کے مطالعے سے غیر ملکی ادیبوں، ان کی تخلیقات اور مغربی منظر نامے سے نہ صرف واقفیت ہوتی ہے بلکہ ان سے ایک بامعنی رشتہ بھی استوار ہوتا ہے۔ محمود ہاشمی نے میر، غالب اور نظیر اکبر آبادی پر تفصیلی اور تجزیاتی مضامین قلمبند کئے ہیں جو ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ 'قراۃ العین حیدر' بھی ان کا ایک فکر انگیز مضمون ہے۔ ان مضامین میں بھی بعض باتوں سے یقیناً اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ سچ ہے کہ مذکورہ مضامین مکتبی اور تدریسی نوعیت کے نہیں بلکہ قابل لحاظ اور توجہ طلب ہیں۔

ان کے علاوہ دوسرے مضامین بھی کم اہم نہیں ہیں۔ میں اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں کہ دراصل ان مضامین کو ان کے اصل سیاق و سباق میں دیکھے جانے کی ضرورت ہے، کیوں کہ یہ اپنے وقت کے شعر و ادب کے کئی نئے دروازے وا کرتے ہیں اور اس ضمن میں فکر و نظر کی نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ بطور مثال 'پچویشن روڈ' سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:۔

> "مجھے اس پر اصرار نہیں کہ فرد کا لفظ استعمال کرتے ہوئے غالب نے جدید ذہن کے تصور کی ہمنوائی کی یا نقادوں کی ایک بڑی فوج کو للکارا۔ مجھے یہ بھی نہیں کہنا کہ غالب حقیقت پرستی یا حقیقی تنقید کے سلسلے میں یہ کہتے ہوئے ہمیں للکار گئے:
>
> نہیں گر سر و برگ ادراک معنی
> تماشائے نیرنگ وصورت سلامت
>
> بات یہ ہے کہ ناقدین اور ان کے نظریات تو آتے جاتے رہیں گے لیکن غالب کا شعر تو ایک ازلی صحیفہ ہے جس کی عمر کا تعین کرنا یا جس کے تخلیقی تجربے کی وسعت یا حدود کا اندازہ لگانا کائنات کی پہنائیوں تک پہنچنے اور نیچر کے اسرار و رموز کو جان لینے کے برابر ہے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ غالب نے زمین پر رہتے ہوئے کائنات میں جگمگاتے ہوئے ستاروں اور کہکشاؤں کو چھیڑنے اور ان کو چھو کر دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ کام کسی زبان، کسی تہذیب میں شاذ و نادر ہوتا ہے۔ اس کی تائید کے لئے کسی

ن م راشد، کسی میراجی کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

('انبوہ زوال پرستاں' ص ۵۱، ۵۲)

اب غور کیجئے کہ غالب کی عظمت کے سلسلے میں اس سے زیادہ اور کیا لکھا جا سکتا ہے۔ ہمینگ وے کے حوالے سے محمود ہاشمی 'ایک خطرناک میلان' میں لکھتے ہیں:۔

"ہیمنگ وے دوسری جنگ عظیم میں ایمبولینس کا ڈرائیور تھا۔ جب وہ زخمیوں سے بھری ہوئی ایمبولینس لے کر روانہ ہوتا تو جنگی حکمت عملی کے تحت رکاوٹوں سے بھری ہوئی سڑکوں پر اسے بار بار وین کو روکنا پڑتا تھا۔ زخمی کراہتے ہوئے چیخنے لگتے تھے۔ آسمانوں پر بمبار جہازوں کی گونج، سڑک پر رکاوٹیں اور زخمیوں کی چیخ پکار —— اسی کربناک منظر میں اس کی معصومیت کا خون ہو گیا تھا۔ یہ اس کا مسئلہ تھا۔ اسی لئے ہیمنگ وے کی کہانی 'The Soldier's Home' میں جب ایک سپاہی جنگ سے واپس گھر آتا ہے تو اسے تمام ماحول ایک عجب بے نیازی اور بے حسی کا حامل نظر آنے لگتا ہے اور اس کا کرب مختلف مدارج طے کرتا ہوا اس انسان کا کرب بن جاتا ہے جس نے جنگ کی ہولناکیوں کو دیکھا سمجھا اور محسوس کیا ہے لیکن اس کی بات سننے اور اسے سمجھانے والا کوئی نہیں۔

ہمینگ وے کے برعکس ہمارے یہاں معصومیت کا پروردہ ادیب اور شاعر آج بھی تمام تر معصومیت سے (فلمی انداز میں) دل دینے اور عشق کا درد سمیٹنے کا دکھڑا رو رہا ہے گویا وہاں معصومیت کا قتل یا زوال ایک مسئلہ ہے اور یہاں معصومیت کا وجود ایک مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں کا آدمی معصومیت کے استحکام کا متلاشی ہے اور ہمارے یہاں کا آدمی اسے تیاگنے کے جتن کر رہا ہے۔

جدید ادب میں ایک موضوع نئی شہری زندگی اور اس زندگی میں خود کی تنہائی کا ہے۔ یہ مسئلہ مغربی اور مشرقی دونوں طرح کے ادب میں موجود ہے لیکن شہری زندگی میں فرد کی تنہائی کی حقیقت بھی ایک مثال کے ذریعے سمجھ لیجئے۔

نیویارک بہت بڑا شہر ہے۔ بڑے شہروں سے بھی بڑا یا کم از کم ہمارے ملک کے شہروں سے تو زیادہ ہی بڑا ہے۔ امریکی ٹینکس کے امام جیک

کروک (Jack Kerouce) کی ایک کہانی 'The Time of the Greek'
میں اس کا ہیرو پیٹر کہتا ہے 'ٹائم اسکوائر کو پار کرتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اپنی روح کے ایک وسیع ترین ریلوے یارڈ کو کراس کر رہا ہوں' اس جملے کا مقصد یہ ہے کہ نیویارک کا آدمی اپنے حواس کے ذریعہ خارج کے عوامل سے جو تجربہ اور مشاہدہ حاصل کرتا ہے، وہ اسکے روحانی خلفشار کا باعث بنتا ہے یعنی نیویارک کی شہری زندگی کے انتشار کو محسوس کرنے والے فنکار کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، وہ اپنے حواس سے کام لیتا ہے اور نئی شہری زندگی میں نظریاتی، معاشی، اقتصادی، روحانی، معاشرتی اور زندگی کے ہر شعبہ کی درجہ بندی سے پیدا ہونے والے تضاد اور انتشار کو محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے اسے نئی شہری زندگی کو اپنا مسئلہ بنانے کا حق حاصل ہے۔"

یہ طویل اقتباس میں نے بلاوجہ نہیں درج کیا ہے بلکہ جدید ادب میں تنہائی کا جو تصور رہا ہے خصوصاً اردو میں، اسکی ایک طرح سے وضاحت ہے۔ ظاہر ہے یہ نقطۂ نظر آج قابل قبول نہیں، لیکن یہ سچ ہے کہ ابتدائی دور کی یہ باتیں جدیدیت کا اپنے وقت میں خمیر تیار کر رہی تھیں۔ اسی طرح ''انبوہ زوال پرستاں'' آج کے منظر نامے میں اہم نہیں۔ اسلئے زوال پرستی جیسی کچھ بھی ہو اور جہاں جہاں ہو قابل تحسین نہیں، چاہے اس باب میں بودلئیر اور اس کے ہم نواؤں کو جتنی شدت سے پیش کیا جائے۔ لہذا کہہ سکتے ہیں کہ یہ انفعالی کیفیت آج کے منظر نامے میں بالکل بے معنی ہے۔ لیکن اپنے وقت میں، اس کی اہمیت رہی تھی اور اسکے اثرات دور رس رہے تھے۔

''انبوہ زوال پرستاں'' کو اس کے Context اور اس کے وقت کے دائرے میں دیکھنا چاہئے۔ گذشتہ پچاس سال کے ادبی وتنقیدی سفر کے سیاق میں اس کی حیثیت یقیناً دستاویزی ہوگی لیکن نئے نکات، نئے پہلو اور نئی روشنی میں یہ مضامین بس تاریخی حیثیت رکھیں گے اور یہ بڑی بات ہے۔ اس حوالے سے محمود ہاشمی کی ادبی اہمیت اور رفعت بھی پہچانی جاتی رہے گی۔

کتاب مجلد ہے۔ کمپیوٹر کمپوزنگ، عمدہ کاغذ اور نفیس طباعت کے پیش نظر یہ دیدہ زیب اور دلکش ہے۔ لیکن ۳۱۰ صفحات کے لحاظ سے پانچ سو روپے قیمت بہت زیادہ ہے جو کہ خریدار کو یقیناً گراں گزرے گی۔

مبصر: ہمایوں اشرف

نکتہ اور نکتہ داں

آپ سے فون پر بات ہوئی تھی۔ حسب وعدہ ایک غیر مطبوعہ افسانہ ارسال خدمت ہے آپ کا پرچہ ملتا رہتا ہے۔

اپنی صحت کا خیال رکھئے۔ محمود ہاشمی کے انتقال کی خبر سن کر دکھ ہوا۔ سب لوگ جلدی جلدی جارہے ہیں، جلد یا بدیر جانا تو سب کو ہی ہے۔ احباب کو میرا سلام کہئے گا۔

○اقبال مجید ۔ بھوپال

اس دن بھری دوپہری اور میری گھنگھور تنہائی کے درمیان تمہارا فون آگیا تو لگا کہ فاختہ زیتون کی ڈالی لے کر آ گئی، لگا میں تنہا نہیں ہوں، گو کہ اس دم میرا حال یہ تھا کہ:

"دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا"

"مباحثہ" کی نیو دنوں دن اونچی ہوتی جارہی ہے۔ اس کا ثبوت زیر نظر دونوں شمارے ۳۱ اور ۳۲ ہیں۔ میری طرف سے اتنے صاف ستھرے اور بہترین مشمولات کے ساتھ "مباحثہ" کے ان شماروں کی اشاعت کیلئے دلی مبارکباد قبول کرو۔ ان کے مطالعے نے جی خوش کر دیا۔

عبدالصمد کی صاف اور سادہ تحریر ہمیشہ کی طرح دامن دل کھینچتی ہے۔ ایک چھوٹا سا تجربہ، ایک مختصر سا بیان بڑی بات کا غماز ہے اور تم نے اپنے اداریے میں ٹھیک ہی لکھا ہے کہ اس مواد پر ایک ناول تعمیر ہو سکتا ہے۔ پھر بھی اس افسانہ (جی میم صاحب) کا اختصار معنی خیز ہے۔

منظر اعجاز کی فکری کشاکش پر لکھتے ہوئے تضادات کی کیفیتوں پر تم نے مختصر لیکن سیر حاصل بحث کی ہے اور حسب دستور اپنی دانشورانہ دیانتداری سے لبریز تمہارا یہ جملہ ـــ "کہ تخلیقی

ذہن نقاد کی گرفت سے باہر ہی ہو جاتا ہے ..... اور نقاد جب شعر کہتا ہے تب وہ دوٹوک ہونا چاہتا ہے، جو لازماً تخلیق کا جوہر نہیں ہے۔" تمہارے جیسا جرأت مند، سچا اور مستند ناقد ہی اس وسیع القلبی کے ساتھ ایسا لکھ سکتا ہے۔ تمہارے ان جملوں نے مجھے کلیم صاحب کی یاد دلا دی اور ناصر کاظمی کا یہ شعر یاد آ گیا:

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

یہ ان لوگوں کے لئے لمحہ فکر ہے جو خود سے خود کو اردو ادب کی آبرو لکھ کر ایوان ادب کے پچھلے دروازے سے داخل ہو کر صف اول میں کھڑا ہونے کی کوشش رائیگاں کرتے ہیں۔

منظر اعجاز صاحب علم بھی ہیں اور صاحب دل بھی ہیں اور خالی ڈھول پیٹے بغیر، خاموشی سے تخلیقی کام کرتے ہیں۔

کلام حیدری کی شخصیت اور فن پر معصوم کاظمی کا مضمون معلوماتی بھی ہے، تجزیاتی بھی اور بڑی حد تک مدلل بھی۔ ان کی تحریر سے کلام حیدری کی شخصیت کے بہت سے عیاں اور نہاں پہلو سامنے آ جاتے ہیں اور ان کی شخصیت کے تضادات بھی واضح ہوتے ہیں۔ خواتین کے استحصال کی بہت سی صورتیں باعث فکر و الم ہوتی ہیں۔ پارو کا سائبان مانو بھی ایک صورت ہے۔ کہکشاں پروین کے "سراب" میں ویرانی بھی ہے، خاموش احتجاج بھی ہے، ایک گھٹی ہوئی چیخ بھی ہے، ایک ٹوٹا ہوا شیشہ اور چبھتی ہوئی کرچیاں بھی ہیں۔ کہکشاں پروین کے قلم کی فسوں گری سب کچھ سہج سبھاؤ کہہ جاتی ہے اور دیرپا تاثر چھوڑ جاتی ہے۔

تبصروں کے ذیل میں کرامت علی کرامت، شکیل الرحمٰن اور خالد جاوید کی کتابوں پر تمہارے تبصرے بھرپور ہیں، دوٹوک ہیں اور بے لاگ ہیں اور مفصل بھی ہیں۔ کتاب کی شبیہ اور اس کے مدوجزر قاری کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اردو میں ایسے معروضی اور بے لوث تبصرے نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

گذشتہ (۳۱) شمارہ میں میرا کانت کا افسانہ "کاغذی برج" (ہندی) تو شہر عشق کی داستان ہے یا امرت منتھن ہے، فیصلہ مشکل ہے۔ ایسی روانی اور ایسی کہانی کے ساتھ حیدر آباد کی تاریخ کا آئینہ دکھا جانا لائق صد ستائش ہے۔ یہ فکشن سے آگے کی چیز Faction ہے۔ اس افسانہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندی کا کتھا ساہتیہ کتنا آگے جا چکا ہے۔ یہ "مباحثہ" کا احسان ہے کہ اردو سے باہر کا ادب بھی اور وہ بھی اتنے اعلیٰ درجے کا پڑھنے کو مل جاتا ہے۔ سنا

ہے کہ میرا کانت کا ایک ناول بھی آیا ہے۔ کیا خوب ہوتا اگر قسط وار اس کے ابواب بھی "مباحثہ" میں آ جاتے۔ بہر حال تمہارے اس انتخاب کی بھی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ کچھ ہی دن ہوئے ہم نے ایک فلم دیکھی تھی "یاترا"۔ اس میں حیدر آباد اور اس کی مہندی گلی کے معاملات آئے ہیں، نانا پاٹ کر اور ریکھا نے بڑا تاثر دیا ہے اس فلم کو۔ لیکن میرا کانت کا لطف بیان اس سے بھی سوا ہے۔

لطف الرحمٰن کے اشعار اور ان کی شعریات کے حوالے سے (شمارہ ۳۱) تمہارے مضمون کا اگر تذکرہ نہ کیا جائے تو کفر کا مرتکب ہو جاؤں گا۔ کیسے بلیغ اور واضح اشارے ہیں کہ "ایک ایسا اسلوب جو خوشبو کو ایک منزل عطا کر دے اور ایسی معجز نما ہنر مندی جو پتھر کو سیل میں بدل دے، فطرت کے مناظر کے وہ پہلو پیش کرتے ہیں جو کمال فنکاری سے ہی ابھر سکتے ہیں۔" اس کے علاوہ "صداقتوں کی شعری جہات" کا بھی تم نے خوب احاطہ کیا ہے۔ خود نمائی اور خود تشہیری سے کوسوں دور لطف الرحمٰن عام ادبی حافظے کی شئے نہیں ہیں۔ "بوسہ نم" حرف تمنا ہے اور اس پر وہ جذبہ دل جو در اصل احساس غم ہے اور دل وحشی کی متاع عزیز ہے۔ ان کے ایسے پرکار، رمز آشنا اور گہری معنویت کے حامل اشعار کو پڑھنا وجد آفریں تجربہ ہے۔ ان کے یہاں تو "نور سحر" بھی ہے اور "رنگ شفق" بھی۔ ذہنی بالیدگی اور ارتفاع کا اظہار بھی ہے اور ان کے اشعار کی ساری فضا یوں ہے کہ "کچھ ان کا فسانہ ہے، کچھ میری کہانی ہے" اپنے غیر مشروط وجود کو مکمل طور پر فنکاری کے سپرد کر کے کمال بے اعتنائی سے زندگی کا تماشہ دیکھنے والا یہ شاعر مجھے وہ یوگی نظر آتا ہے جو اپنا ایک تارہ بجاتا ہوا کسی ندی کے کنارے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا ہو۔

ان کے علاوہ ادبی خبروں اور خطوط کا حصہ بھی اہم ہے۔ آخرش میں "مباحثہ" کے ان قارئین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنہوں نے شمارہ ۳۱ کے افسانہ "آخر کار" کو پسند کیا۔ خدا کرے تمہارا قلم مزید فعال ہو۔ "مباحثہ" ترقی کی اور منزلیں طے کرے اور تم ہمیشہ کے لئے صحت یاب ہو جاؤ۔ آمین

○ شفیع جاوید، پٹنہ

"مباحثہ" کا تازہ شمارہ (اپریل تا جولائی ۲۰۰۹ء) موصول ہوا۔ جی خوش ہوا۔ سارے مضامین اور منظومات قابل مطالعہ ہیں۔ اہم چیز پرچہ کا معیار ہے اور مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اسکا معیار ہی اس کے وقیع ہونے کا ضامن ہے۔ "غزل بے شرط" ایک اچھا سلسلہ ہے، اس سے کسی اہم شاعر کو اختصار میں پڑھ کر اس کی تفہیم میں مدد ملے گی۔ اس شمارہ میں مظہر امام

کے پچاس منتخب اشعار کے مطالعہ سے ان کی عظمت کا احساس ہوتا ہے۔ جینت پرمار کی دس غزلیں خوب ہیں۔ چھوٹی بحروں میں فکر انگیز بات کہنا ان کا ہنر ہے۔ نثری حصہ زیر مطالعہ ہے۔

آخر میں یہ عرض کروں کہ قمر رئیس کے سانحہ ارتحال پر دلی کے تعزیتی جلسہ کی رپورٹ پڑھ کر جی اداس ہو گیا۔ مرحوم کی محبتیں مجھے حاصل تھیں۔ چند سال قبل انہوں نے میری شاعری پر ایک مبسوط مضمون لکھا تھا جسے آپ نے "مباحثہ" میں شائع کیا تھا۔ وہ اپنے خطوط سے میرا حوصلہ بڑھاتے رہتے تھے۔ ان کی بے وقت رحلت اردو کی معاصر تنقید اور ادبی صحافت کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائیں۔ آمین

○ ظفر گورکھپوری، ممبئی

آپ کا رسالہ "مباحثہ" اپریل تا جولائی ۲۰۰۹ء بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ پابندی سے رسالہ بھجواتے ہیں۔ میں کئی برسوں سے جسم میں خون کی کمی کے باعث متعدد امراض کا شکار ہو کر زیر علاج رہا ہوں۔ جب بھی طبیعت ذرا ٹھیک ہوئی تو اپنی تازہ تصنیف "بہار اور جھارکھنڈ کے اہم اہل قلم" کے لئے کام کرتا رہا۔ اللہ کا شکر ہے کہ کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کے بعد مسودہ طباعت کے لئے دہلی بھیج دیا ہے۔ آپ کی تنقید نگاری پر تحریر کردہ مضمون اس کتاب میں شامل ہے۔ کتاب آجائے تو آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

ادھر ذرا سکون ملا ہے تو چند مضامین کی صاف کاپیاں تیار کی ہیں۔ میرے لئے یہی کام دشوار اور Time taking ہے۔ ایک مضمون "وہاب دانش کی نظم نگاری کا تجزیاتی مطالعہ" "مباحثہ" میں اشاعت کے لئے ارسال کر رہا ہوں۔ یقین ہے آپ اسے زیر ترتیب شمارہ میں شامل کر لیں گے۔

رسائل بہت سارے میز کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ اگر توجہ سے امروز فردا میں پڑھ سکا تو تاثرات لکھنے کی سعی کروں گا۔ اس رسالہ کے ذریعہ ہی آپ کی تحریریں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ اپنی کتابیں آپ کن لوگوں کو بھجواتے ہیں مجھے نہیں معلوم!

مجھے آپ کی علالت کی خبر ملی تھی، اس وقت میں چلنے پھرنے سے بھی بہت حد تک معذور تھا خدا کرے اب آپ صحت یاب ہو چکے ہوں۔ ممکن ہو تو اپنی خیریت سے آگاہ کر دیا کریں۔ میں ممنون رہوں گا۔ باقی اللہ کا شکر ہے۔

○ ظہیر غازی پوری، ہزاری باغ

"مباحثہ" کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ شکریہ۔

کوئی ڈھائی سال قبل میں نے زرِ خریداری سالانہ ارسال خدمت کیا تھا، یافتگی کی رسید کا انتظار ہے۔

گزارش ہے کہ ساہتیہ اکاڈمی کا وقیع وموقر انعام تفویض ہونے پر مبارک باد پیش کرنے کی غرض سے میں نے آنجناب کو فون کیا تھا۔ دوران گفتگو عشرت ظفر صاحب کی تصنیف ''حرف باریاب'' (راقم کی غزل کا تنقیدی مطالعہ) کے تبصرہ کی طرف توجہ مبذول کرنے پر آنجناب نے فرمایا تھا کہ تبصرے کے واسطے محولہ کتاب شیلف سے نکالی ہے۔ اس کے بعد ''راہی کی سرگزشت'' بھی جنوری ۲۰۰۹ء میں تبصرہ کی قطار میں شامل ہوگئی تھی۔

ادھر آپ کی علالت کی خبر ملی تھی۔ رب کریم صحت وطمانیت کے ساتھ آپ کو درازی عمر سے نوازے۔ آمین ثم آمین۔

○ غلام مرتضیٰ راہی، فتح پور

''مباحثہ'' کے تازہ شمارہ کے بارے میں محمد سالم صاحب نے امریکہ سے اور پروفیسر فاروق احمد صدیقی صاحب نے مظفر پور سے فون کر کے مجھے مطلع کیا کہ آپ نے شکیل الرحمٰن کی کتاب ''اساطیر کی جمالیات'' پر تبصرہ میں ان کے جو اقتباسات نقل کیے ان میں کوئی اقتباس بہت متنازعہ فیہ ہے۔

''مباحثہ'' میرے پاس ابھی پہنچا نہیں ہے، میں نے سید احمد قادری کے یہاں سے رسالہ منگوایا، آپ کا تبصرہ پڑھا اور مجھے احساس ہوا کہ آپ نے نادانستہ ایک ہنگامے کو آواز دے دی ہے۔

میرے خیال میں اسلامی قصص کے حوالے سے آپ نے شکیل الرحمٰن صاحب کا جو بیان ''قرآن پاک میں پیغمبروں کے معجزوں کے ذکر'' سے شروع کیا ہے اور ''ان تمام نام نہاد داستانوں کا معیار کہیں بھی اوپر نہیں اٹھتا'' پر ختم کیا ہے۔ اس بیان کے چار حصے کیے جا سکتے ہیں:

(الف) قرآن پاک میں پیغمبروں کے ذکر اور ان کی حکایتوں کو پا کر خرافات وتوہمات سے بھرے قصوں کہانیوں کا ایک بازار سا لگ گیا ہے۔

(ب) بلاشبہ قرآن کریم کے معجزات وحکایات کے گہرے اثرات ہوئے ہیں لیکن اساطیری رنگ زندگی کے واقعات وکردار کو خواہ مسخ کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ مثلاً خدا آدم اور حوا کا نکاح پڑھاتے ہیں...... حضرت یوسف اور زلیخا کی شادی، حضرت سلیمان اور ملکہ بلقیس کی من گھڑت کہانیاں۔

(ج) شب معراج کا ذکر کچھ اس طرح جیسے کوئی اساطیری کہانی سنا رہے ہوں۔

(ج) شب معراج کا ذکر کچھ اس طرح جیسے کوئی اساطیری کہانی سن رہے ہوں۔

(د) ایسے سینکڑوں واقعات ہیں جنھیں سن کر لطف آتا ہے اور نہ یقین .... ان تمام نام نہاد داستانوں کا معیار کہیں بھی اوپر نہیں اٹھتا۔

اس اقتباس کے چاروں حصوں کا سنجیدگی سے مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ مصنف نہ تو قرآن کریم میں موجود پیغمبروں اور ان سے متعلق حکایتوں کا منکر ہے، نہ ہی مسلمانوں کی زندگی پر ان معجزات و حکایات کے گہرے اثرات سے غافل ہے۔ مزید برآں اس اقتباس سے شب معراج کے انکار کا بھی کوئی (مذموم) پہلو نمایاں نہیں ہوتا۔

صرف اتنا احساس ہوتا ہے کہ شکیل الرحمن صاحب ان دنوں اہل قرآن کی طرح سوچ رہے ہیں جن کے نزدیک قرآن کے علاوہ باقی مصادر (نعوذ باللہ) غیر معتبر ہیں۔

ویسے ہمارے علما کی ایک بڑی تعداد خود بھی ''اسرائیلیت'' سے حیران و پریشان رہی ہے اور اس بات کی کوشاں بھی رہی ہے کہ عامۃ المسلمین اپنے آپ کو ''اسرائیلی مصادر'' سے کنارے کرلیں۔ مگر جہاں تک سوال شب معراج کا ہے اس سے متعلق واقعات میں ''اسرائیلیات'' کا کیا گزر۔ یہاں تو واقعات کے بیان کے لئے ہمارے علما نے احادیث وسیر کا ہی سہارا لیا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ ''مولفین صحاح ستہ'' سے آج تک ضعیف احادیث اور صحیح وحسن احادیث کی چھان پھٹک کا سلسلہ جاری ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اس میں زیادہ نزلہ صوفیا پر گرتا ہے۔

پھر بھی شکیل الرحمن صاحب ''شب معراج'' کے بارے میں اثباتی رویہ اپناتے ہوئے اس سے متعلق واقعات کے جس طرح انکاری ہیں وہ ان کے ''اہل قرآن'' اور ''منکرین حدیث'' کے قریب ہونے کی کہانی کہہ رہا ہے۔

راقم کے نزدیک اہل قرآن ہو جانا یا منکر حدیث ہو جانا کوئی معتدل یا مقبول اور خود میری نظر میں صائب رویہ نہیں ہے۔ مگر راقم اس سے بھی واقف ہے کہ مسلمانوں کے درمیان ایسے مسلمانوں کی کمی نہیں ہے۔

یہ مسلمانوں کے درمیان موجود فرقوں کا معاملہ ہے۔ وہ جانیں اور خدا جانے۔

میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ مذکورہ بالا عبارت سے خدا اور رسولؐ کے تئیں شکیل الرحمن صاحب کا انحراف یا بدگمانی ثابت نہیں کی جا سکتی۔ ان کا گلہ شکوہ یہ ہے کہ ''مذہبی زندگی کے واقعات و کردار کو خواہ مخواہ (بہ خیال شکیل الرحمن غیر قرآنی واقعات کے ذریعہ) مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔'' ابن تیمیہ سے ابن عبدالوہاب نجدی تک لوگ بہت سی چیزوں کا انکار کرتے ہیں، یہاں تک کہ

حضرت امام غزالی نے مضنون بہ علی غیر اہلہ میں معجزات کے عنوان سے ایک مستقل مضمون لکھا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ و التمثل الخیالی اشہر ہذہ الاقسام (معجزات کی تینوں اقسام [حسی، خیالی اور عقلی] میں سے تمثیل خیالی زیادہ متعارف ہے) امام صاحب پر بڑے لکھنے والوں میں سے کسی نے یہ بھی لکھا کہ "امام صاحب کے فقرے سے تمثیل خیالی کی ترجیح کی خوشبو آتی ہے۔" اور اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ مگر افسوس کی ایک ہی بات ہے، ادیب کو ادب (Literature) کا بھی خیال رکھنا چاہئے اور بیان میں ادب (Due regard) کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے۔

شکیل الرحمٰن صاحب نے جن ہستیوں کا ذکر کیا ہے ہم تو ان کی گلی کے کتوں کے برابر بھی نہیں ہیں۔ ہمیں ان کے حوالے سے کی جانے والی ہر گفتگو میں بہت چوکنا اور باادب رہنا چاہئے۔ باخدا دیوانہ باشد با محمدؐ ہوشیار۔ اس تحریر میں شکیل الرحمٰن صاحب ادب کی سرحدیں پھلانگ گئے ہیں۔ ان کے بعض جملے حیرت زدہ کر دیتے۔ "خرافات، بدنما دھبے، توہمات، نام نہاد"۔ ان جملوں کی جگہ کچھ اور جملے بھی استعمال کئے جا سکتے تھے۔ اس اقتباس میں ان کی اصل غرض اسرائیلیات اور غیر قرآنی قصص کو اگر رد کر دینا ہے تو اس منشا کی تکمیل کے لئے سرسید، اقبال اور غزالی کی طرح بڑے خوبصورت انداز میں گفتگو آگے بڑھ سکتی تھی۔ وہ تو بڑے "لکھاڑی" آدمی ہیں۔ حیرت ہے کہ ان جیسا اچھی نثر لکھنے والا اتنی خراب نثر کیسے لکھ گیا۔

○ حسین الحق، گیا

"مباحثہ" کے حالیہ شمارے میں معصوم کاظمی صاحب کا مضمون "کلام حیدری: شخصیت اور فن" نظر سے گزرا۔ اور یہ دیکھ کر تقویت ہوئی کہ آپ کے رسالے کے ذریعہ کلام صاحب کو یاد کیا گیا ہے۔

معصوم کاظمی نے خلوص دل کے ساتھ ذرا غیر جانبدارانہ تحقیقی اور تنقیدی رویہ اپناتے ہوئے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے۔ ادب سے کلام حیدری کا اٹوٹ رشتہ، اردو زبان کے لئے ان کے دل میں گہری محبت، سماج کی مثبت قدروں سے ان کا لگاؤ، ان کی آزادانہ سوچ اور بے باکی گفتار و کردار، ان تمام باتوں کا ذکر اس مضمون میں شامل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات پر بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ کچھ مضامین اور تبصرے جو بکھرے پڑے ہیں، انہیں یکجا کرنے کی ضرورت ہے۔ حالانکہ اردو دنیا کے ادبی خزانے میں اتنے سارے ہیرے اور جواہرات بھرے پڑے ہیں کہ ان کی چمک کے آگے یہ مٹھی بھر اجالا شاید نظر نہ آسکے۔ مگر جیسا کہ

خود کلام صاحب نے بھی ایک جگہ اپنے رسالہ ''آہنگ'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا ''یہ ایک تپسوی کی تپسیا ہے۔''

ایسے میں ''تپسیا'' اگر پھل ہو جائے تو یہی کچھ کم نہیں۔

میں شکر گزار ہوں کہ معصوم کاظمی صاحب نے اپنے اس مضمون کے ذریعہ کلام حیدری کی ادبی اور صحافتی خدمات کی طرف توجہ دلائی ہے۔

○شاهده حیدری، گیا

پارسل ملتے ہی آپ کو فون کیا۔ شکر ہے صحیح سلامت مل گیا۔ آپ کا بیحد شکریہ۔ حسب معمول ''مباحثہ'' نے اپنی گرفت میں لے لیا۔

آپ کا رسالہ پڑھنا شروع کرتی ہوں تو رکھنے کا جی نہیں چاہتا۔ لیکن مصروفیات جان لیوا ہیں، جن سے جان بچانا ممکن نہیں۔ اس میں میری نظم شامل ہے، جس کے لئے بیحد ممنون ہوں۔

لطف الرحمٰن صاحب کے فن پر آپ کا مضمون بھرپور ہے اور عمدہ ہے۔ جناب ساقی فاروقی کے اشعار کا کیا کہنا۔ تبصرے بھی عمدہ ہیں۔ آپ کا شکریہ کہ کئی کاپیاں بھیج دی ہیں۔ یہاں کے ادبی حلقوں میں معتبر لوگوں کو بھیج رہی ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کے خریدار بن سکیں۔ میں ''قصہ بے سمت زندگی کا'' حاصل کرنا چاہتی ہوں کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کو رقم بھیج دوں اور آپ مجھے بھجوا دیں؟

''مباحثہ'' ابھی زیر مطالعہ ہے۔ تفصیل سے بعد میں لکھوں گی۔ عقیل رضوی صاحب کا مضمون پھر سے بھیج رہی ہوں اور ایک نظم۔ انہیں اگلے شمارے میں شامل کریں تو ممنون رہوں گی۔ خدا کرے آپ کی صحت اچھی ہو۔ ہم دونوں ہی آپ کے لئے ہمیشہ دعائیں کرتے ہیں۔ آپ کے لئے ہمارے دلوں جو محبت اور احترام ہے وہ اللہ جانتا ہے۔

○پروین شیر، کنیڈا

''مباحثہ'' برابر مطالعہ میں ہے۔ سرورق کے ساتھ میٹر بھی معیاری رہتے ہیں۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ یہ رسالہ دائم و قائم رہے۔

ایک انٹرویو سلام بن رزاق سے بھجوا رہا ہوں، اسے آئندہ شمارہ میں شریک اشاعت کرلیں۔ شکریہ۔

○نثار احمد صدیقی، ممبئی

"مباحثہ" ۳۲ پیش نظر ہے۔ آپ جس محنت اور عرق ریزی کے ساتھ رسالے کو نکال رہے ہیں وہ قابل تحسین بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ اللہ آپ کو صحتمند اور خوش وخرم رکھے۔ (آمین)

آپ کا تحریر کردہ اداریہ "اور یہ شمارہ" ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہم آئندہ صفحات کی تصویر صاف صاف دیکھ لیتے ہیں۔ آپ کے اداریے کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اس کے ذریعہ بعض ایسے ادبی نکات کی وضاحت ہو جاتی ہے جو عموماً قارئین کی نگاہ سے اوجھل رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر زیر نظر شمارے میں ساجد رشید کے افسانوں پر جناب گوپی چند نارنگ کے مضمون کے سلسلے میں آپ نے جس آسانی کے ساتھ "زیرناف" کی تشریح کی ہے وہ صرف آپ ہی کا حصہ ہے، وگرنہ اس کی تعبیر وتشریح کرنے کے لئے ایک دفتر درکار تھا۔ ساجد رشید ہمارے عہد کے ممتاز ترین افسانہ نگار ہیں۔ وہ کم لکھتے ہیں لیکن جب لکھتے ہیں تو ایک ماسٹر پیس ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ "نیاورق" کے تازہ شمارہ میں ان کا افسانہ "ایک مردہ سر کی حکایت" ایک الگ ہی دنیا کی سیر کراتا ہے۔ دہشت گردی پر اتنا عمدہ افسانہ کم از کم اردو میں ابھی تک منصۂ شہود پر نہیں آیا ہے۔ اسی طرح جناب عبدالصمد کے افسانے "جی میم صاحب" کے سلسلے میں آپ کی رائے کہ "عبدالصمد جو بات اشارے میں کہتے ہیں اس کی تفصیل میں جائیے تو ایک ضخیم ناول کی ضرورت محسوس ہوگی۔" موصوف کے فن پر ایسا جامع اور بھرپور تبصرہ ہے جس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ آپ نے اس ایک جملے میں گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ بیشک آج عبدالصمد صاحب کا شمار اردو کے ان گنے چنے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے خون جگر سے اس فن کی آبیاری کی ہے۔ ان کا افسانہ "جی میم صاحب" پڑھ کر تو میں عجیب وغریب کیفیت سے دوچار ہو گیا۔ انہوں نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے جو اب تک اچھوتا تھا۔ ایک طرف خاتون کلکٹر ہیں جو مسلمانوں کے خاص تہوار عید میں اس طرح شریک ہونا چاہتی ہیں گویا وہ بھی انہیں کا ایک حصہ ہیں۔ اس کے لئے وہ اپنے مسلمان ڈرائیور کے ساتھ عید کے لئے خاص کپڑوں اور دیگر لوازمات کا اہتمام کرتی ہیں۔ مینا بازار جا کر زری، کامدانی اور موتیوں والا قیمتی سوٹ خریدتی ہیں۔ اس کے بعد سلیم شاہی جوتیاں، رنگ برنگی چوڑیاں، بالوں پر چھڑکنے کے لئے افشاں، ہاتھوں میں رچانے کے لئے مہندی وغیرہ خریدی گئی۔ اس دوران ان کا اندرونی جوش وخروش پورے افسانے میں ایک طاقتور انڈر کرنٹ کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ اور جب وہ پوری تیاری کے ساتھ عید کے روز ایک مسلمان ڈپٹی کلکٹر کے یہاں عید ملنے جاتی ہیں تو انہیں عجیب صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کلکٹر صاحب بجائے کرتہ پائجامہ کے نئے

سوٹ اور ٹائی میں ملبوس تھے۔ لڑکے شرٹ پینٹ میں تھے لڑکیوں نے اسلامی لباس کی جگہ جینز اور رنگین کرتے پہن رکھے تھے۔ بیگم نے ایک قیمتی پھول دار ساڑی پہن رکھی تھی۔ کسی کے ہاتھ پیروں میں حنا نہیں لگی تھی۔ نہ ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں۔ ڈپٹی کلکٹر صاحب نے گھر آئے مہمان کی تواضع عطر اور سوئیوں کے بجائے امپورٹیڈ اسپرے اور بازاری مٹھائیوں سے کیا۔ یہ سب دیکھ کر کلکٹر صاحب کا سارا جوش وخروش ٹھنڈا پڑ گیا اور انہوں نے گھر جا کر عید کے لئے خریدی ہوئی ساری چیزیں تحفتاً اپنے ڈرائیور کو دے دیں۔

عبدالصمد صاحب نے اس مختصر افسانے میں کتنی بڑی بات کہہ دی ہے۔ ایک جانب تو دوسرے ہماری تہذیب وتمدن سے اس قدر متاثر ہیں کہ وہ ہماری خوشی میں شریک ہونے کے لئے ہماری وضع قطع اختیار کرتے ہیں اور دوسری جانب ہم ہیں کہ اگر ہمیں معمولی سی افسری بھی ہاتھ لگ جاتی ہے تو ہم اپنی تہذیبی روایات کو بالائے طاق رکھ کر موڈرن بننے کی بھونڈی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں ایک اور بات قابل غور ہے اور وہ یہ کہ اردو بھی ہماری تہذیب کا ایک حصہ ہے اور جسے خود ہم نے دوسروں کی نقل کرنے کے سلسلے میں خود سے دور کر دیا ہے۔ گو کہ اس افسانے میں ''اردو'' کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ہے تاہم ایک حساس قاری اس بات کو بھی محسوس کر لیتا ہے۔ عبدالصمد صاحب کو اس کامیاب افسانے کے لئے میری جانب سے مبارک باد۔

جناب معصوم عزیز کاظمی کا مضمون ''کلام حیدری: شخصیت اور فن'' میں نے دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ اس مضمون کی خاص بات یہ ہے کہ کاظمی صاحب نے نہایت غیر جانبداری اور ایمانداری کے ساتھ واقعات کو پیش کیا ہے جس سے مرحوم کی شخصیت کے وہ گوشے بھی منور ہو گئے جو اب تک ہماری نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ اس کی اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔

آپ کے تحریر کردہ مضامین ''منیر سیفی: مکان ولامکاں کا شاعر'' اور ''منظر اعجاز: فکری کشاکش کا شاعر'' دونوں کے شعری امتیازات کو اس طرح سامنے لاتا ہے کہ منیر سیفی اور منظر اعجاز کی تہہ دار شاعری کی ساری پرتیں خود بخود کھلتی چلی جاتی ہیں۔ دونوں کی دس دس غزلیں شامل کر کے آپ نے قارئین کی تسکین کا اچھا سامان فراہم کیا ہے۔

جناب مظہر امام کے منتخب اشعار خوب ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ ان اشعار کا انتخاب خود شاعر نے کیا ہے۔ یہ سلسلہ غالباً ''مباحثہ'' نے ہی شروع کیا ہے۔ اس سلسلے کو جاری رہنا چاہئے۔

○ اقبال حسن آزاد۔ مونگیر

''مباحثہ'' شمارہ ۳۲ ملا، جی خوش ہو گیا۔

شمارے کی بڑی خوبی ہوتی ہے اس کی Readibility۔ جہاں ہر بڑا ادب ہی ادب ہو وہاں کوئی کیسے اس حصار سے باہر آ سکتا ہے۔ شمارے کی ترتیب و تزئین کا بھی اپنا الگ انداز ہے۔ بات اداریے سے ہی شروع کروں تو شاید گفتگو چاہ کر بھی ادھوری ہی رہ جائے گی۔ دراصل گزشتہ دو دہائیوں سے جو رسائل بتدریج شائع ہو رہے ہیں ان کا مزاج ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آتا وجہ صاف ہے کہ وہ Self projeotion کے مرض میں مبتلا ہیں یا پھر رسم ادائیگی کی روایت کے امین ہیں۔ آپ نے باضابطہ طور پر مباحثہ کی تمام تر مشمولات کو پیش نظر رکھ کر فرداً فرداً ہر مواد پر اپنا تبصرہ کچھ اس انداز میں کیا ہے کہ قاری انکے مطالعے کے لئے مجبور ہو جائے۔ صرف ترتیب دینا تو بہت سہل تھا لیکن ان پر فوری طور پر کوئی رائے قائم کرنا خاصا مشکل ترین مرحلہ تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ادب کی سب سے بڑی آبیاری ہے۔ تخلیق کار یہ ضرور چاہتا ہے کہ قاری ان پر اپنا کوئی ردعمل ظاہر کرے۔ آپ نے تنقیدی بصیرت کو ملحوظ رکھ کر جس فنی چابکدستی کے ساتھ ادب کی موجودہ صورت حال کو پیش کرتے ہوئے عصری ادب کا نیا منظر نامہ گڑھا ہے اس سے متعلقہ ادیبوں ت، تخلیق کاروں کو کافی تقویت کا احساس ہوگا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ آپ کا اداریہ پڑھنے کے بعد گفتگو کا لامتناہی سلسلہ جاری ہو سکتا ہے اسلئے بعض مشمولات کے حوالے سے اپنے تاثرات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ خالق کائنات پر مکمل یقین رکھنے والا بخوبی جانتا ہے کہ ہم جس عالم میں رہتے ہیں اور جس نقش فریادی کو محسوس کرتے ہیں ان میں کہیں کچھ بھی اپنا نہیں ہے۔ فریب پیہم نہ ہو تو اپنے ہونے کا احساس بھی محض سراب جیسا ہی ہے۔ اگر واقعی اپنا وجود ہوتا تو پھر یقیناً لافانی ہوتا اسے مٹنا نہیں چاہئے تھا۔ ہم جو بنائے گئے تو اس احساس کے ساتھ زندگی عطا کی گئی کہ یہ فنا ہو جائے گی۔ بھلا فنا ہونے والی کسی شئے پر ہم کیوں ناز کریں۔ اس جذبے کی اتنی خوبصورت ترجمانی مظہر امام نے کی ہے کہ ایک بار پھر ایسا معلوم ہونے لگا کہ جس فنا پر کسی حد تک اپنا ایمان ہے شاید وہ بھی میری دسترس سے باہر ہے:

ترا ہی بحر ، سفینہ رواں بھی تیرا ہے
بھنور بھی تیرے ہیں اور بادباں بھی تیرا ہے
ہے تیری بزم میں آخر کہاں جگہ میری؟
چراغ بھی ہیں ترے اور دھواں بھی تیرا ہے
دیا ہے کیوں مجھے لوح و قلم کا بار گراں؟
کہ گردشیں بھی تری، آسماں بھی تیرا ہے
میں تھک کے بیٹھ رہوں یا قدم بڑھائے چلوں؟
فنا بھی تیری ہے، نام و نشاں بھی تیرا ہے

خالق کائنات کے حکم سے ہی ہم میں سے بیشتر افراد تمام عمر جدو جہد کرتے ہیں۔ جب کوئی ثمرہ ملتا ہے تو پھر جینے کی خواہش ہوتی ہے۔ وہ زندگی جو ہم صعوبتوں میں جی نہیں سکے وہ زندگی جو چھوٹی چھوٹی خواہشوں کی تکمیل سے بھی دور رہی وہ زندگی جو دھوپ کا پربت کاٹ کر راہیں ہموار کرتی رہی۔ اچانک وہ مقام آجاتا ہے کہ آرزوئیں خوف و ہراس میں تبدیل ہو جاتی ہیں، وقت فنا کا احساس دلانے لگتا ہے۔ ناکردہ گناہوں کی سزا جھیلنے کی ساعتیں کسی اندھے کنویں میں کھو جاتی ہیں اور کوئی ان لمحوں میں ہمارے درد کی آواز بھی نہیں سن پاتا۔

بہرکیف! یہ شمارہ گوپی چند نارنگ، قمر رئیس، کوثر مظہری کے افکار، کلام حیدری، شہریار پر لکھے گئے مضامین عبدالصمد، کہکشاں پروین، کہکشاں انجم، منیر سیفی، سلطان اختر، ارمان نجمی، شیدا رومانی، نعمان شوق، منور رانا، ظفر گورکھپوری، جینت پرمار، شاہد اختر وغیرہ کی تخلیقات کے لئے بھی یاد کیا جائے گا۔

○ قاسم خورشید، پٹنہ

''مباحثہ'' (۳۲) ملا۔ اول تا آخر سب کچھ پڑھ گیا۔ حصہ مضامین میں وحید اختر کی غزل پر کوثر مظہری کی تحریر اور شہریار کی شاعری پر عالم خورشید اور امتیاز احمد کے مضامین لائق

مطالعہ ہیں۔ عبد الصمد کا افسانہ 'جی میم صاحب' بظاہر سادہ ہونے کے باوجود اپنے اندر ایک کیفیت رکھتا ہے۔ اس افسانے کی خوبی اس کی جامعیت ہے۔ مظہر امام کی حمدیہ غزل کے کئی اشعار دل کو چھو گئے۔ شاعر نے بارگاہ ایزدی میں جس نیاز مندانہ لہجے میں اپنی عاجزی اور بیکسی کا اظہار کیا ہے وہ قاری کو ایک انوکھے کیف سے دوچار کرتا ہے۔ موصوف کے پچاس اشعار بھی نظر سے گزرے۔ ان میں کئی عمدہ اشعار شامل ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر یہ انتخاب مظہر امام کی نمائندگی تسلی بخش انداز میں نہیں کرتا۔ خیر، شاعر کا اپنا انتخاب ہے، کوئی دوسرا اس میں کیا کہہ سکتا ہے! ظفر گورکھپوری کی غزل کا یہ شعر بطور خاص پسند آیا:

تم خوش ہو کہ حاصل ہے تمہیں چپ کا سہارا
دن آئے گا، جب یہ بھی تمہاری نہ رہے گی

خصوصی مطالعہ کے تحت آپ کے تحریر کردہ دونوں مضامین متعلقہ شعرا (منظر اعجاز اور منیر سیفی) کی غزل گوئی کے ساتھ پورا انصاف کرتے ہیں اور ان کے مطالعے سے قاری کو ایک طرح کی سیری حاصل ہوتی ہے۔ ''نئی شاعری، نئے تقاضے'' کے ذیل میں ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ شاعر جینت پرمار کی جو دس غزلیں شائع ہوئی ہیں وہ اپنی جگہ ٹھیک سہی، لیکن میری حقیر رائے میں ان کی نظمیہ شاعری ہی ان کی اصل پہچان ہے۔ بر سبیل تذکرہ یہ بھی عرض کردوں کہ شاعر کی شائع شدہ غزلوں میں سے ایک غزل کا مطلع محل نظر ہے:

فجر کا پہلا ستارہ ضرور آئے گا
سفر میں اب کے کنارہ ضرور آئے گا

اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہاں لفظ 'فجر' کو بروزن 'سفر' باندھا گیا ہے جب کہ اس کی صحیح بندش بروزن 'شہر' ہی ہو سکتی ہے۔

زیر نظر شمارے میں معروف افسانہ نگار شوکت حیات کا ایک قدرے طویل مراسلہ پڑھنے کو ملا۔ فاضل مراسلہ نگار نے دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ:

''...... بہت سارے بقراط ناقد بغیر اداریہ لکھے ہوئے پرچے نکالتے رہے، ہم لوگ بھی کتنے بدعقل اور احمق تھے کہ ایسے لوگوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے رہے۔'' اس سلسلے میں عرض ہے کہ کسی رسالے میں ایک مدت تک تواتر سے شائع ہونے کے باوجود اگر شوکت حیات کی کوئی بھی کہانی اس رسالے کے کسی خصوصی انتخاب میں نہیں آسکی تو یہ بات بلاشبہ حیرت انگیز ہے اور اس معاملے میں ان کا بددل ہونا ایک فطری امر ہے، تاہم اس بددلی کے (درپردہ) اظہار میں ایسا

عامیانہ لب ولہجہ اختیار کرنا شوکت حیات جیسے سنجیدہ قلم کار کو زیب نہیں دیتا۔ ایسے جملوں سے دل کی بھڑاس تو نکالی جاسکتی ہے لیکن اس سے خود لکھنے والے کا اپنا وقار مجروح ہوتا ہے، کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگڑتا!

آپ کا تحریر کردہ اداریہ اس خوبی سے پورے شمارے کا احاطہ کرتا ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد قاری کو پورا رسالہ پڑھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ بعض بظاہر اوسط درجہ کی چیزیں اداریہ میں لکھے گئے تعارفی جملوں کی وجہ سے چمک اٹھتی ہیں۔ بلاشبہ یہ "مباحثہ" کا اپنا امتیاز ہے اور اس کے لئے آپ کو مبارک باد کے مستحق ہیں۔

○ ارشد کمال، دھلی

"مباحثہ" کا شمارہ ۳۱ محترم زبیر رضوی کے توسط سے ملا۔ اس سے قبل بھی محترم رفعت سروش (مرحوم) کے ذریعہ مطالعہ میں رہا ہے۔ آپ عمر رسیدگی اور علالت کے باوجود جس ذمہ داری کے ساتھ ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ قابل تحسین ہے۔ میں نے آپ کے ذریعہ مرتب "تاریخ ادب اردو" کی تینوں جلدیں خرید کر مطالعہ کی ہیں۔ مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ابھی بہت سے ایسے ادیب اور شعرائے کرام کا ان جلدوں میں تذکرہ ہونا رہ گیا ہے جنہوں نے ادب کی خدمت میں اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔ امید ہے کہ آپ چوتھی جلد میں ایسے حضرات کا ذکر ضرور کریں گے۔

○ ذکی طارق، غازی آباد

ایک عرصہ سے "مباحثہ" میرے مطالعہ میں ہے۔ میں بعض ذاتی امور کی بنا پر ایک ڈیڑھ برس سے لکھنے پڑھنے کا کام چھوڑے ہوئے تھا۔ اب ذرا فراغت ہے تو سب سے پہلے آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔

میں بیحد ممنون ہوں کہ آپ "مباحثہ" مجھے مسلسل عنایت فرماتے ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب "تاریخ ادب اردو" کی تیسری جلد میں مجھے بھی شامل کیا ہے۔ اس ذرہ نوازی کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ یہ ادبی تاریخ کی پہلی کتاب ہے جس میں ۱۹۸۰ء کے بعد ابھرنے والی نسل کو شامل کیا گیا ہے۔ آپ کی جملہ تصانیف میرے لئے راہ نما ہے۔ اللہ آپ کو سلامت اور تندرست رکھے۔ آمین۔

○ ارشد عبد الحمید، ٹونک

"مباحثہ" کے کچھ شماروں کا مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ اس معیار کے رسائل ہندو پاک سے

بہت کم ہی نکل رہے ہیں۔ اس خالص ادبی رسالے میں سارے مشمولات انتہائی معیاری اور پر مغز ہوتے ہیں۔ جب مدیر ہی ایک قابل اور معتبر و نکتہ رس انسان ہیں تو ان کا رسالہ کیوں نہ بلند مرتبے کا ہوگا۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ 'شب خون' میں شامل اشاعت ہو کر فخر محسوس کرتے تھے اور ایک یہ زمانہ ہے کہ شاعر و ادیب 'مباحثہ' میں چھپنے کے متمنی ہیں۔ میں بھی اپنی تخلیقات اسی تمنا کے ساتھ بھیج رہا ہوں کہ اس میں ان کی اشاعت ہو جائے تو خود کو معتبر و محترم قیاس کر سکوں۔

○ معراج احمد معراج، آسنسول

خداوند کریم سے دست بہ دعا ہوں کہ آپ اور آپ کے احباب بخیر و عافیت ہوں۔

چند ماہ قبل کی بات کہ سعید روشن صاحب نے مطلع فرمایا کہ ''مباحثہ'' میں میری کتاب ''ادبی گفتگو'' پر ایک سیر حاصل تبصرہ شائع ہوا۔ دیکھا تو بیحد مسرت ہوئی، ملک سے دور رہ کر اپنی کتاب پر تبصرہ کروانے کی پیروی میرے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن آپ جیسے کچھ بے حد ادب ذوق کرم فرما ہیں، جنہوں نے اپنے آپ میری کتاب کو تبصرے سے نوازا، اور وہ بھی اس خوبصورتی کے ساتھ، بیحد ممنون ہوں۔ ہاں، جو خط لکھنے میں دیر ہوئی، اس کے لئے شرمندہ ضرور ہوں، اعمال و اسفار اس میں حائل تھے۔

کاش ''مباحثہ'' مجھے پابندی سے مل سکتا۔ سعید صاحب بھی کویت چھوڑ گئے۔

○ اسلم عمادی، کویت

ابھی تک حیرت ہے کہ ''مباحثہ'' موصول نہ ہوا۔ آپ براہ راست ایجوکیشنل بک ہاؤس کو بھجواتے تو بہت پہلے مل جاتا، مشہور ادارہ ہے۔ میرا پتہ بھی آسان ہے صرف بدر باغ ہی کافی تھا۔ اب تک ساری کاپیاں بھی فروخت ہوگئی ہوتیں۔ اسلوب صاحب نے شاید دو ہفتہ قبل فون کیا کہ انہیں مل گیا ہے۔ قاسمی کو بھی ضرور ملا ہوگا۔ روز ڈاکیہ سے پوچھتا ہوں نفی میں جواب دیتا ہے۔ بہر حال جیسے ہی ملے گا فون سے مطلع کروں گا۔

○ امین اشرف، علی گڑھ

''مباحثہ'' کا شمارہ ۳۲ پیش نظر ہے۔

سرورق روایت کے مطابق رنگوں کی آمیزش کے سبب انتہائی پر کشش اور معنی خیز ہے۔ اس کی ضخامت بہت زیادہ نہیں ہے باوجود اس کے ضخیم سے ضخیم فن پارے کے اوصاف ہیں۔ آپ کا یہ شمارہ بھی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ خاص طور پر اداریے اور ترتیب سے کافی مسرت ہوتی ہے۔ کھلے ذہن سے تخلیقات کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ محترم مظہر امام، محمد فرحت حسین خوشدل کی

حمد مبارک، یعقوب تصور اور حبیب ہاشمی کی پیش کردہ نعت شریف روح افزا ہیں۔آہنگ اور اسلوب بھی دل نشیں ہے۔نثری تخلیقات بھی خوب سے خوب تر ہیں۔غزلوں کا معیار بہت ہی بلند ہے۔نظمیں بھی اپنے اپنے موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے منفرد ہیں۔خاص طور پر ارمان نجمی، شاہد عزیز، نعمان شوق اور جعفر ساہنی کی نظمیں بہت پسند آئیں۔

کچھ مراسلے بھی بلاشبہ توجہ کے لائق ہیں۔کچھ ایسی لغزشیں ہیں جن پر شاید آپ کی نگاہ نہیں پڑ سکی۔

مجموعی اعتبار سے ''مباحثہ'' بلند نہیں بہت بلند ہے۔یہ آپ کی خوبصورت کاوش کا ثمرہ ہے۔

○ ولی مدنی، بیگوسرائے

''مباحثہ'' کے زیر مطالعہ شمارے میں ساجد رشید: مہانگری اور زیر ناف اور سماجی ڈسکورس (گوپی چند نارنگ)، پریم چند کے باغی کردار (پروفیسر قمر رئیس) اور وحید اختر کی غزل (کوثر مظہری) اچھے مضامین ہیں۔قمر رئیس (مرحوم) نے پریم چند کو ذرا مختلف انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔پریم چند شناسی میں اسے میں ایک نئی جہت کا اضافہ تصور کرتا ہوں۔پریم چند میں اتنی آگ ہوگی میں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ٹھیک ہی تو ہے، تپ تپ ہی کر تو کوئی کندن بنتا ہے۔گوپی چند نارنگ کا مضمون ساجد رشید کے فکری و فنی اختصاص کو واضح کرتے ہوئے ایک نئی تنقیدی عبارت کا اعلان نامہ بن جاتا ہے۔نارنگ کا ذہن و مطالعہ روشن اور اسلوب شستہ و شگفتہ ہے۔دوران مطالعہ آخر آخر تک میری دلچسپی و دلجمعی برقرار رہی۔وحید اختر میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔کوثر مظہری نے ان کی غزلوں کا حقیقت پسندانہ مطالعہ پیش کیا ہے۔وحید اختر کی غزل کے تعلق سے کوثر مظہری کی اپنی رائے اور اپنی Thesis ہے۔دیگر مابعد ترقی پسند شاعروں پر بھی اسی نہج سے کام ہونا چاہئے۔ہاں، ایک بات میں بھول رہا تھا، نارنگ صاحب نے ساجد رشید کے افسانوں کا جس خوبی سے جائزہ لیا ہے میری گزارش ہے کہ وہ ان کے ہمعصر شاعروں (عبداللہ کمال وغیرہ) کے فکر و فن کی بھی اسی خوبی سے گرہ کشائی فرمائیں۔

آپ کے دونوں مضامین ''منیر سیفی: مکاں اور لامکاں کا شاعر'' اور ''منظر اعجاز: فکری کشاکش کا شاعر'' آپ کے مخصوص مزاج و منہاج کے نمائندہ اور بصیرت افروز علمی و ادبی مکاشفات سے آراستہ ہیں۔

افسانے پڑھنے کی اس بار ہمت نہیں ہوئی۔نظموں میں ارمان نجمی، شاہد اختر، شاہد عزیز اور شارق عدیل کی نظمیں متوجہ کرتی ہیں۔غزلوں میں ضیا فاروقی اور ظفر گورکھپوری کو پڑھ کر جی

خوش ہوا۔ظفر انصاری ظفر،صوفیہ انجم تاج اور علیم صبانویدی کی غزلوں نے بھی مایوس نہیں کیا۔آپ کے تبصروں کا کیا کہنا، پڑھتا ہوں اور سر دھنتا ہوں۔

○محمد خالد عبیدی، پٹنہ

"مباحثہ۳۲واں شمارہ اپنے جاذب نظر سرورق اور قیمتی مشمولات کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ ترتیب پر نظر پڑتے ہی "مہانگری زیرِ ناف" کے Projection نے Perplextion میں مبتلا کردیا تھا،لیکن مندرجات کی خبر دینے والے اداریے میں آپکے Explanation نے اس Confusion کو دور کردیا۔

محتویات بھی اچھے ہیں اور قاری کو دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔رسالے کے آغاز اور انجام کا ربط انوکھا ہے۔خالق کی تعریف سے اس کی ابتدا اور مخلوق کی تعریف پر اس کی انتہا ذوق آگیں بھی ہے اور وجد آفریں بھی۔

"افکار" کا باب شاہکار مضامین سے آراستہ ہے۔"زندگی" زندگی کی قاش کہی جانے والی صنف سخن افسانے سے مزین ہے۔

"خصوصی مطالعہ" میں منیر سیفی صاحب کی غزلیں "لذت خانماں برباد" کی یاددہانی، بے گھری کی اذیت وکربنا کی اور دماغی اسکرین پر خانہ بدوشوں کی تصویر کشی کرتی ہوئی اس المیہ کے شکار انسانی ذہنوں کی نمائندہ مورخ بنی ہوئی ہیں۔وہیں دوسری طرف منظر اعجاز صاحب فکروفن اور فطرت کی منظر نگاری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔اور آپ کے ان دونوں سے متعلق مضامین نے شعری کنہیات تک رسائی پیدا کر کے فکری بصیرت بخش دی۔

"سازِ تخلیق" کا کالم بھی شعری عجز کے باوجود زندگی کا آئینہ دار ہے۔

"سوز دروں" کے تحت پیش کردہ غزلیں بہت خوب ہیں اور فکری ذوق کی آبیاری کررہی ہیں۔خصوصاً "غزل بے شرط" کے ضمن میں پیش ہونے والے پچاس اشعار شعری جلا بخشنے میں ممد ومعاون ہیں۔

"نئی شاعری، نئے تقاضے" غزلوں کی نئی حسین بستیوں کو آباد کرنے کا ایک مفید سلسلہ ہے۔گویا یہ Literama کا Panorama ہے۔

"میرے نقطۂ نظر سے" خفتہ اور نادیدہ کتابستان کی سیر کراتے ہوئے علمی غذا فراہم کراتا ہے۔

"متفرقات" میں دلوں کی تپش سے چراغ جلانے والے اور اپنی تشنہ لبی سے میکدے بنانے والے رفتگاں وقائماں کا ذکر ہے۔اس طرح سے یہ یادیار مہرباں بھی ہے اور وجود قدرداں بھی۔

"نکتہ اور نکتہ داں" رسالے کے ڈائرکشن اور ڈائمنشن کا اچھا گوشہ ہے جس میں میرے خط کی شمولیت ترغیب وتشویق کے لئے مہمیز ثابت ہوئی۔

کیا ہی اچھا ہوتا اس موقر کتاب نما میں انگریزی اور فارسی ادبیات کو بھی جگہ دی جاتی۔ مدیر چونکہ خود بھی Languist ہیں اور Lingua-lover بھی۔ اسلئے یہ درخواست ان کے شایان شان ہے، تاکہ رسالے کی منفرد پہچان ہو۔

مضمون نگاران کی عدم خوش خطی، کمپوزر کی نہایت سرعت کے ساتھ کمپوزنگ کی وادی کو طے کرنے کی کوشش اور پروف ریڈر کی مطلوبہ ومتعلقہ امر کی جانکاری کی کمی ہی سے طباعتی اغلاط تخلیقات کا مقدر بن جاتے ہیں۔ اس تثلیث کی تطبیق کیسے ہو؟ یہ ایک سوال ہے۔ تاہم جو کچھ ہے خوب ہے اور خوب سے خوب تر کی گنجائش سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔

○ **راجو خان، بیگوسرائے**

"مباحثہ" کا تازہ شمارہ ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ میری نظموں کی اشاعت کیلئے مزید شکریہ۔

آج کے دور میں "مباحثہ" جیسا معیاری ادبی جریدہ نکالنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ آپ نے زمانے کی تند ہواؤں کے مقابلے میں ادب کا چراغ روشن رکھا ہے۔ تمام نگارشات معیاری ہیں اور فکر ونظر کو دعوت دیتے ہیں۔ اقبال مجید کے ناول پر علی احمد فاطمی کا مضمون بہت ہی خوب ہے۔ احمد یوسف کے ناولٹ "پستی کے مکیں" پر ڈاکٹر منظر حسین کا فنی تجزیہ بھی بے پناہ ہے۔ ان دونوں قلم کاروں نے اپنی بھرپور صلاحیت اور تنقیدی بصیرت سے کام لیا ہے۔ اس طرح اقبال مجید کی ناول نگاری اور احمد یوسف کے فن تخلیق پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ "حرام جادی" کا تعارف وتجزیہ بھی بہت خوب ہے۔ میرا کانت کے افسانے "کاغذی برج" کا ترجمہ بہت ہی مناسب ہے۔ جناب منظر کلیم نے ترجمے کا حق ادا کر دیا ہے۔ "کاغذی برج" تاریخی پس منظر میں لکھا گیا افسانہ ہے اور بہت خوب ہے۔ اس کا ٹریٹمنٹ ہی اس کی جان ہے۔ اس سے افسانہ نگار کے بالغ نظر اور فن پر دسترس ہونے کا پتہ ملتا ہے۔ یہ ایک طویل افسانہ ہے۔ اس کا ترجمہ نہایت ہی مشکل کام تھا۔ لیکن منظر کلیم نے اس کا بہت ہی خوبصورت ترجمہ کیا ہے۔ اس کا ڈکشن اس بات کی دلیل ہے کہ منظر کلیم افسانے کی روح کی گہرائی تک پہنچ گئے اور جو کچھ پیش کیا ہے اس میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ یہی ترجمہ کی خوبی ہے۔ اسے پڑھ کر طبع زاد ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

لطف الرحمٰن کے شعری رویے پر آپ کا مقالہ بھرپور ہے۔ آپ جس موضوع پر قلم

اٹھاتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ آپ کا اداریہ تو اپنے طرز کا انوکھا ہوتا ہے۔ اس مرتبہ بھی آپ کا اداریہ بہت پسند آیا۔ آپ کے اداریے کو پڑھ کر تخلیقات کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔ آپ کی صلاحیت کو زمانہ تسلیم کرتا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ آپ کو تنقید نگاری میں "بہار کی آبرو" کہا تھا۔ آج میرا خیال ہے کہ آپ "اردو تنقید کی آبرو" ہیں۔

○ حفیظ بیتاب ، جمشید پور

ارمان نجمی کی مہربانی سے "مباحثہ" کے شمارے ملتے رہتے ہیں۔ ہر شمارہ پہلے سے بہتر نظر آتا ہے۔ شمارہ نمبر ۳۲ میں "نئی شاعری، نئے تقاضے" کے تحت جینت پرمار کی غزلیں لطف دے گئیں۔ ان کا مخصوص انداز ایک انوکھاپن لئے ہوئے ہے۔

معصوم عزیز کاظمی کا مضمون "کلام حیدری: شخصیت اور فن" کافی تفصیلی جائزہ ہے۔ لیکن اس میں رانچی کے ذکر کی کمی محسوس ہوئی۔ کلام حیدری کے قیام رانچی کے دوران جو حلقہ احباب تھا اس میں انور عظیم، اختر پیامی اور پرکاش فکری وہ لوگ تھے جن کا وسیع ادبی مطالعہ اور شعور اس دور سے ہم آہنگ تھا اور اس کا کافی اثر کلام حیدری پر پڑا۔

کلام حیدری نے اس دوران ایک قلمی رسالے کا اجرا بھی کیا تھا۔ افسوس ہے کہ مجھے اس کا نام یاد نہیں ہے۔ یہ ان کے ادارتی سفر کا آغاز تھا۔

کلام حیدری کو گیا میں جو وسائل حاصل ہوئے ان کا انہوں نے بخوبی استعمال کیا، سرزمین کو ایک معتبر ادبی حیثیت دے دی۔

کمپوزیشن کی چند غلطیاں مخل نظر ہوئیں۔ جیسے "رینا ہاؤس" کو "اپنا ہاؤس" بنا دیا۔ کاتب نو پر ذرا نظر رکھی جائے تو بہتر ہوگا۔

وحید الحسن، یو پی

○○

MOBAHASA-VOL.8, ISSUE NO.33, 2009
Ashrafi House , Haroon Nagar, Sector-2, Patna-801505